HIJAZ LEATHER PVT LTD.
MANUFACTURERS AND EXPORTERS OF SHEEP AND GOAT FINISHED LEATHERS.
HEAD OFFICE:
17/7. WUTHUCATTAN STREET
PERIAMET, CHENNAI, 600003.
INDIA.
TEL: +91 44 25612969
+91 44 25615938
Website: www.hijazleathers.com
TANNERY:
1056.A -1, KONAMEDU,
VANIYAMBAI - 635751
TIRUPATTUR ,TAMIL NADU, INDIA
E mail: pervaze@hijazleathers.com
hussam@hijazleathers.com
anas@hijazleathers.com
muneerideal@yahoo.com
MANUFACTURERS OF
HIGH QUALITY FASHION GLOVES,
SPORTS GLOVES AND WORK GLOVES.
560, NATIONAL HIGHWAY-46
GIRISAMUDIRAM,
VANIYAMBADI - 636751
TRIPATTUR, TAMIL NADU, INDIA
Website: www.hijazkuroda.com
E mail: pmyousuf@gmail.com
yousuf@hijazkuroda.com
zaki@hijazleathers.com
adnanvnbp@gmail.com
ASSOCIATE CONCERN:
HIJAZ KURODA GLOVES COMPANY PVT. LTD.

"اس شخص سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔" (قرآن)

दावत

ہفت روزہ

دعوت

نئی دہلی

DAWAT, NEW DELHI

www.dawatnews.net

Vol No:(47) Issue No:(25) 05th July to 11th July 2026. Pages:24 Rs:20/-

جلد نمبر:(۴۷)شمارہ نمبر:(۲۵)تاریخ ۱۹/محرم ۲۵/محرم ۱۴۴۸ھ صفحات:۲۴ قیمت:۲۰روپیے

اس شمارہ میں مزید آپ کے لیے:

تصویر وطن، دعوت میل، روداد ہند، آئینہ سماج، کاروان، ملک وملّت، شعور و آگہی، دین ودانش، معیشت وتجارت، عالم ریختہ، کتابستان، احوال عالم اور چلڈرن سرکل کے علاوہ اور بھی بہت کچھ۔۔

خالدوسکوپ

خالدوسکوپ:
ایک نیا کالم واقعات، رجحانات اور فکری زاویے

صفحہ نمبر 04

خصوصی رپورٹ

کیا ایک نیا بے وطن طبقہ ابھر رہا ہے؟
پڑھیے خصوصی رپورٹ

صفحہ نمبر 05

جائزہ

فیک نیوز کی فیکٹری:
ایک خاموش سیاسی ہتھیار

صفحہ نمبر 07

مُلک وملّت

بیانیے کی جنگ اور شناخت کا مستقبل،
ایک فکر انگیز تحریر

صفحہ نمبر 10

اہم ترین 2-3

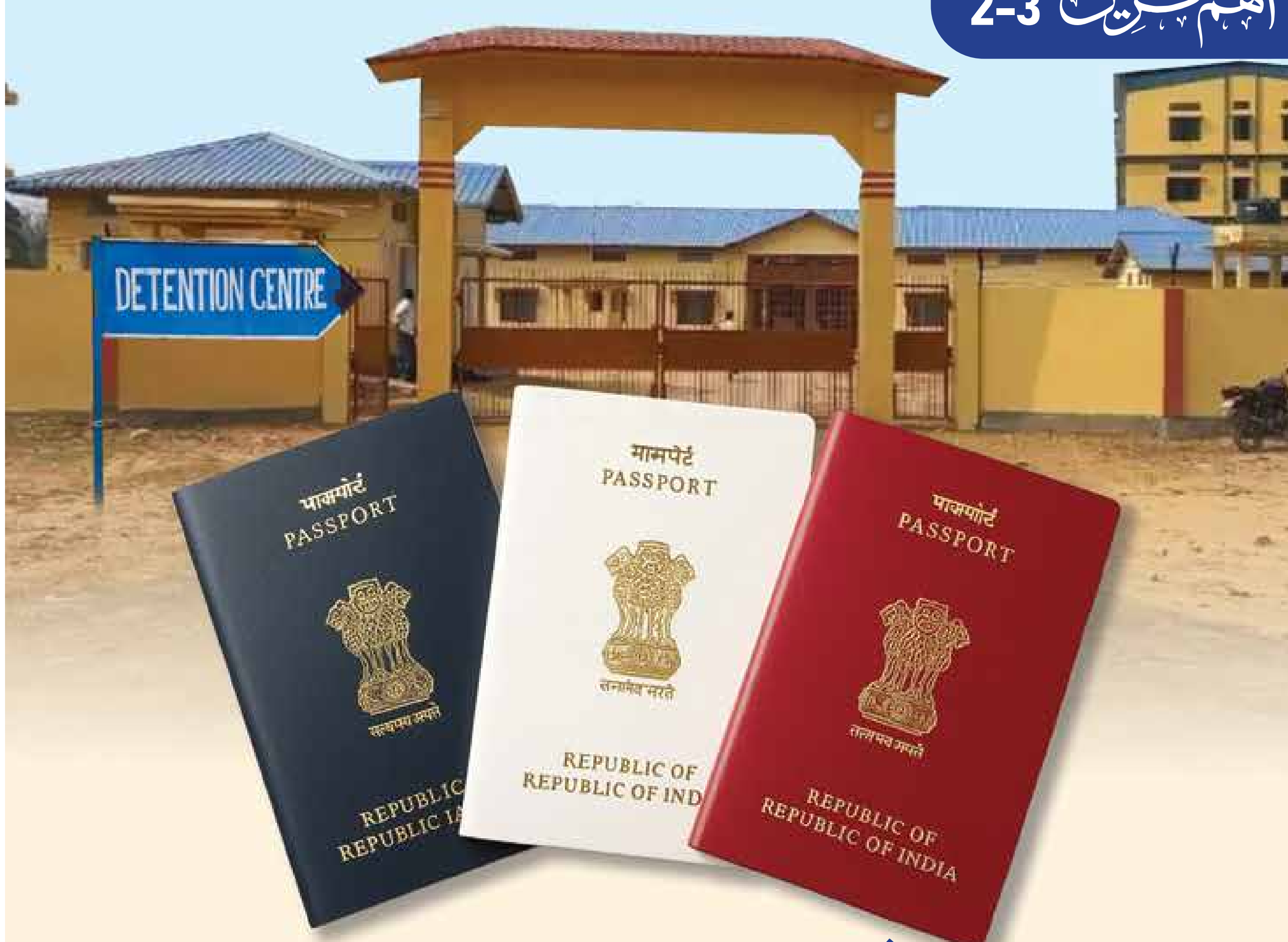

شہریت کا بحران

شہریت حق نہیں بس امتحان

تصور شہریت میں شمولیت نہیں اخراج

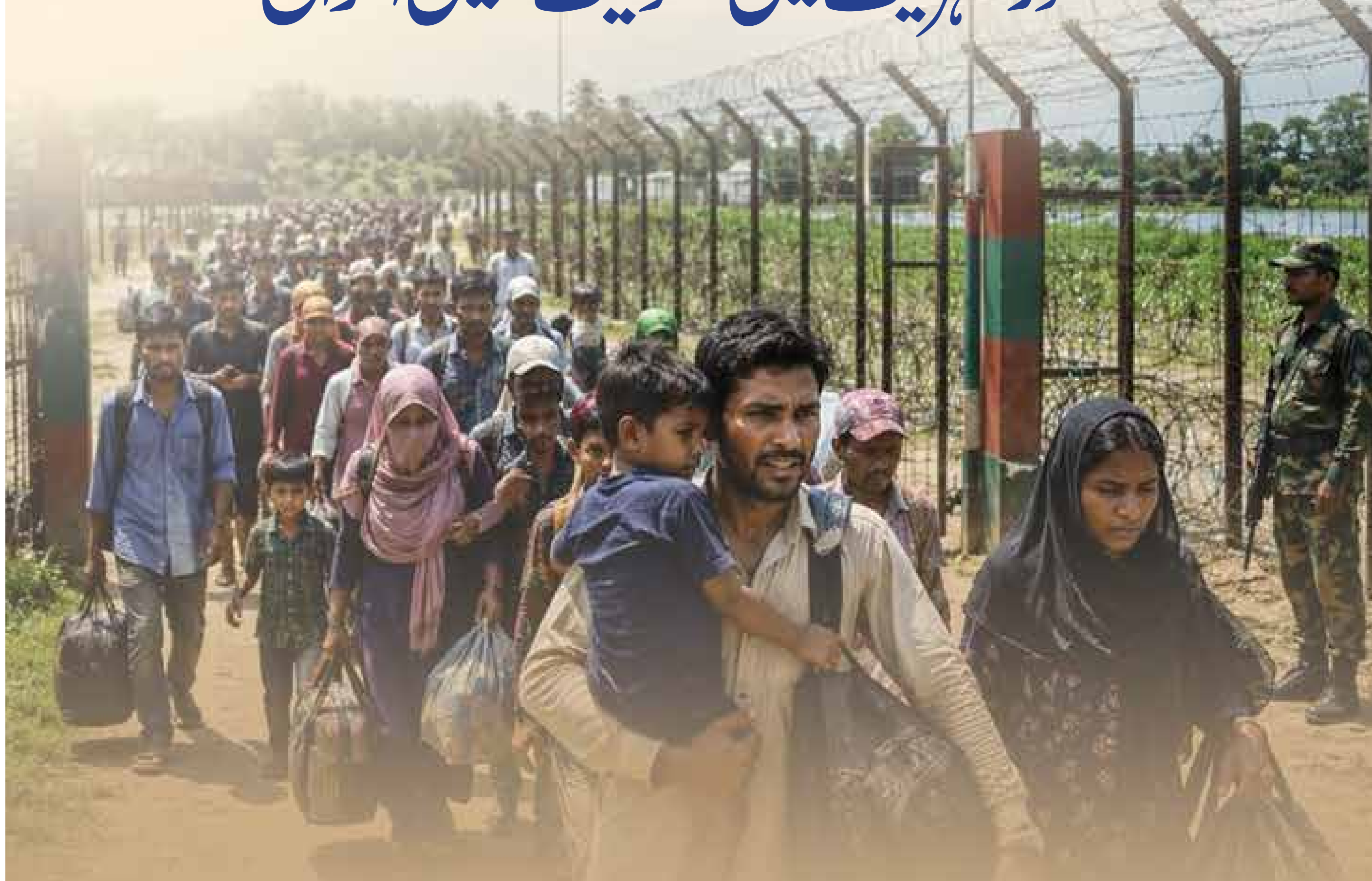

"اس شخص سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔" (قرآن)

दावत ہفت روزہ دعوت نئی دہلی

DAWAT, NEW DELHI

www.dawatnews.net

شہریت کے ثبوت کا بحران: کیا ہر بھارتی شہری مشتبہ بننے جا رہا ہے؟

کاغذوں کا جنجال: آدھار، ووٹر کارڈ کے بعد اب پاسپورٹ بھی ناکافی، عام شہری کہاں جائے؟

بے زمین، بے گھر اور اب... بے وطن؟

نوراللہ جاوید، کولکاتا

بحث صرف پاسپورٹ کی قانونی حیثیت کی نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا ریاست اپنے شہری کو شناخت عطا کرتی ہے یا شہری ہر مرحلے پر اپنی شناخت ثابت کرنے پر مجبور ہوگا؟ اگر ریاست کے جاری کردہ کاغذات بھی کافی نہ ہوں تو پھر شہریت ایک حق نہیں بلکہ ایک مسلسل امتحان بن جاتی ہے۔

وزارتِ خارجہ کے ایک گمنام افسر کے حوالے سے سامنے آنے والے اس بیان نے کہ "پاسپورٹ شہریت کا ثبوت نہیں بلکہ صرف ایک سفری دستاویز ہے" بھارت میں شہریت اور اس کے ثبوت کے حوالے سے ایک نئی اور نہایت سنجیدہ بحث چھیڑ دی ہے کہ اگر پاسپورٹ بھی شہریت کا ثبوت نہیں تو پھر ایک عام بھارتی شہری اپنی شہریت کیسے ثابت کرے گا؟ حالیہ برسوں میں حکومت کی متعدد پالیسیوں نے یہ سوال ضرور پیدا کیا ہے کہ کیا شہریت کے تصور میں 'شمولیت' کے بجائے 'اخراج' کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے؟ اسپیشل انٹینسیو ریویژن (ایس آئی آر) کے عمل نے اس تشویش کو مزید گہرا کر دیا ہے۔ حکومت اور عدالتیں یہ کہتی ہیں کہ اگر کسی شخص کا نام ایس آئی آر کے بعد ووٹر لسٹ میں شامل نہ ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بھارتی شہری نہیں ہے، کیونکہ ایس آئی آر کا مقصد شہریت کی جانچ نہیں تھا۔ لیکن وہیں یہی حکومتیں ووٹر فہرست سے خارج ہونے والے افراد کو مختلف فلاحی اسکیموں سے محروم کرنے کی راہ پر گامزن ہیں۔ یہ ایک ایسا تضاد ہے جس نے کروڑوں شہریوں کو غیر یقینی صورتحال سے دوچار کر دیا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں حکومت یہ واضح کر چکی ہے کہ آدھار کارڈ شہریت کا ثبوت نہیں ہے اور اس مسئلے پر ایک مقدمہ سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت بھی ہے۔ ووٹر شناختی کارڈ اور راشن کارڈ کو بھی شہریت کا حتمی ثبوت تسلیم نہیں کیا گیا ہے، اور اب اگر پاسپورٹ کے بارے میں بھی یہ کہا جائے کہ وہ شہریت کا ثبوت نہیں ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک عام بھارتی شہری کے پاس اپنی شہریت ثابت کرنے کے لیے بچے گا کیا؟

اس بحث کو عملی شکل اس وقت ملی جب انگریزی روزنامہ "دی ٹیلی گراف" کے سابق مدیر آر راج گوپال نے انکشاف کیا کہ SIR کے دوران ووٹر لسٹ سے نام خارج ہونے کے بعد گزشتہ سو دنوں سے ان کے پاسپورٹ کی تجدید رکی ہوئی ہے۔ نتیجتاً وہ امریکہ میں اپنی بیٹی کی شادی میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ اگر ایک معروف صحافی کو یہ مشکلات پیش آسکتی ہیں تو ایک ایسے عام شہری کی حالت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے جس کے پاس نہ وسائل ہیں اور نہ قانونی معاونت۔ بنگال میں ایس آئی آر میں حذف کیے گئے ناموں کے اندراج اور جانچ کے لیے جو ٹربیونل قائم کیے گئے ہیں وہ جس رفتار سے کام کر رہے ہیں تو ایس آئی آر سے باہر رہ جانے والے شہریوں کے معاملات کی جانچ میں کئی دہائیاں لگ سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی شہری کے لیے یہ عذاب سے کم نہیں ہوگا۔

یہ معاملہ اس لیے بھی حیران کن ہے کہ یہی پاسپورٹ دنیا بھر میں بھارت کی جانب سے جاری کردہ ایک سرکاری دستاویز کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ دوسرے ممالک کی حکومتیں، سفارت خانے اور امیگریشن حکام اسی دستاویز کی بنیاد پر یہ یقین کرتے ہیں کہ اس کا حامل شخص بھارت کا تصدیق شدہ شہری ہے، اسی بنیاد پر اسے ویزا جاری کیا جاتا ہے اور داخلے کی اجازت دی جاتی ہے۔ لیکن اگر بھارت خود اپنے جاری کردہ پاسپورٹ کو داخلی معاملات میں شہریت کا معتبر ثبوت ماننے سے انکار کرے تو یہ ایک قانونی تضاد پیدا کرتا ہے کہ جس دستاویز کو بھارت خود دنیا کے سامنے اپنی شہریت کی تصدیق کے لیے استعمال کرتا ہے، اسی دستاویز کو داخلی معاملات میں شہریت کا قطعی ثبوت ماننے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ حکومت اس بیان کے ذریعے کیا پیغام دینا چاہتی ہے اور اس کے پیچھے اصل مقصد کیا ہے؟ کیا یہ محض ایک قانونی وضاحت ہے یا پھر شہریت سے متعلق ایک بڑی سیاسی اور انتظامی حکمت عملی کا حصہ؟ ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم آسام NRC شہریت ترمیمی قانون (CAA) قومی رجسٹر برائے شہریت (NRC) اسپیشل انٹینسیو ریویژن (ایس آئی آر) اور حالیہ سرکاری بیانات کو ایک ہی سلسلے کی کڑیوں کے طور پر دیکھیں تبھی اس پوری کرونولوجی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اصل سوال صرف پاسپورٹ کا نہیں بلکہ ریاست اور شہری کے درمیان اعتماد کے اس رشتے کا ہے جس کی بنیاد ہی شناخت اور شہریت ہے۔ اگر ریاست کے جاری کردہ آدھار، ووٹر شناختی کارڈ، راشن کارڈ اور پاسپورٹ بھی شہریت کا قطعی ثبوت نہیں ہیں تو پھر ایک عام بھارتی شہری آخر کس دروازے پر دستک دے؟

شہریت کے موجودہ بحران کو اگر اسپیشل انٹینسیو ریویژن (SIR) قومی رجسٹر برائے شہریت (NRC) شہریت ترمیمی قانون (CAA) اور نیشنل پاپولیشن رجسٹر (NPR) جیسے اقدامات کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک وسیع تر تصویر سامنے آتی ہے۔ ناقدین کے مطابق یہ تمام اقدامات محض الگ الگ انتظامی یا قانونی فیصلے نہیں ہیں بلکہ شہریت کی جانچ کے ایک ایسے نظام کی تشکیل کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں ہر شہری سے اپنی شناخت اور شہریت ثابت کرنے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک اس پورے عمل میں آبادیاتی تبدیلی (Demographic Change) کے خدشات کو بنیاد بنا کر ریاست کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ کسی بھی شہری سے اس کی شہریت کا ثبوت طلب کرے، جبکہ ثبوت فراہم کرنے کی مکمل ذمہ داری بھی اسی شہری پر عائد ہو۔ آسام کا تجربہ اس پورے بحران کو سمجھنے کے لیے سب سے اہم مثال ہے۔ ریاست میں ہزاروں کروڑ روپے خرچ کر کے قومی رجسٹر برائے شہریت (NRC) کی تیاری کا عمل مکمل کیا گیا۔ اس طویل اور پیچیدہ مشق کے بعد تقریباً 3 کروڑ 11 لاکھ افراد کے نام NRC میں شامل کیے گئے جبکہ 19 لاکھ افراد اس فہرست سے باہر رہ گئے۔ لیکن حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ جن 3 کروڑ سے زائد افراد کی شہریت کی جانچ مکمل ہونے کے بعد انہیں NRC میں شامل کیا گیا انہیں بھی آج تک کسی قسم کا شہریت کا کارڈ یا شہریت کا سرٹیفکیٹ جاری نہیں کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر مستقبل میں ان کی شہریت پر دوبارہ سوال اٹھایا جائے تو وہ آخر کس دستاویز کی بنیاد پر خود کو بھارتی شہری ثابت کریں گے؟ اس صورتحال نے اس وقت مزید تشویش پیدا کر دی جب آسام حکومت نے 18 برس سے زائد عمر کے افراد کے نئے آدھار کارڈ جاری کرنے کے لیے سخت پابندیاں عائد کر دیں اور ان کے لیے اضافی جانچ کو لازمی بنا دیا۔ یہ فیصلہ ایک ایسے وقت میں کیا گیا ہے جب آسام میں آدھار کارڈ کی رسائی اب بھی قومی اوسط سے کم ہے۔ یعنی ایک طرف آدھار کو شہریت کا ثبوت نہیں مانا جاتا اور دوسری طرف اس کے اجرا کو بھی مزید دشوار بنایا جا رہا ہے۔ اس سے یہ خدشہ مزید گہرا ہوتا ہے کہ اگر ریاست اپنے ہی جاری کردہ دستاویزات کو حتمی ثبوت تسلیم نہیں کرتی تو مستقبل میں ایک عام شہری اپنی شہریت کس بنیاد پر ثابت کرے گا؟

شہریت کے موجودہ بحران کو اگر اسپیشل انٹینسیو ریویژن (SIR) قومی رجسٹر برائے شہریت (NRC) شہریت ترمیمی قانون (CAA) اور نیشنل پاپولیشن رجسٹر (NPR) جیسے اقدامات کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک وسیع تر تصویر سامنے آتی ہے۔ ناقدین کے مطابق یہ تمام اقدامات محض الگ الگ انتظامی یا قانونی فیصلے نہیں ہیں بلکہ شہریت کی جانچ کے ایک ایسے نظام کی تشکیل کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں ہر شہری سے اپنی شناخت اور شہریت ثابت کرنے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

مرکزی وزیر داخلہ امت شاہ نے پارلیمنٹ میں قومی رجسٹر برائے شہریت (این آر سی) اور شہریت ترمیمی قانون (CAA) کو ایک ساتھ جوڑتے ہوئے کہا تھا کہ پہلے NRC آئے گا اور اس کے بعد CAA کے ذریعے مخصوص طبقات کو شہریت دی جائے گی۔ انہوں نے اسے کرونولوجی قرار دے کر پورے عمل کی وضاحت کرنے کی کوشش کی لیکن ملک گیر عوامی احتجاج اور سیاسی مخالفت کے بعد حکومت پورے ملک میں NRC نافذ نہیں کر سکی۔ تاہم ناقدین کا کہنا ہے کہ NRC کی جگہ اب اسپیشل انٹینسیو ریویژن (SIR) کے ذریعے ووٹر فہرستوں کی از سر نو جانچ کا عمل شروع کیا گیا ہے۔ آزاد بھارت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ الیکشن کمیشن نے اتنے بڑے پیمانے پر ووٹر فہرستوں کی ایسی جامع نظر ثانی کی، جس کے دوران انتظامی خامیوں کی متعدد شکایات سامنے آئیں۔ کئی مقامات پر ناموں کے ہجے (Spelling) ریکارڈ میں معمولی فرق یا دیگر مبینہ منطقی تضادات کی بنیاد پر ہزاروں افراد کے نام ووٹر لسٹ سے خارج کیے گئے۔ اس نے ایک نئے خدشے کو جنم دیا کہ اگر ووٹر فہرست سے اخراج کا عمل وسیع پیمانے پر جاری رہا تو اس کے سماجی اور قانونی اثرات کیا ہوں گے۔ مغربی بنگال میں اس پورے عمل کو بعض حلقے شہریت ترمیمی قانون (CAA) سے بھی جوڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ ایک تاثر یہ پیدا کیا جا رہا ہے کہ جن افراد کے نام ووٹر فہرست سے خارج ہو گئے ہیں، وہ CAA کے تحت شہریت کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ CAA کے تحت شہریت حاصل کرنے کا عمل بھی اتنا آسان نہیں ہے۔ درخواست گزار کو سب سے پہلے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ 31 دسمبر 2014 سے پہلے پاکستان، بنگلہ دیش یا افغانستان سے مذہبی بنیاد پر ظلم و ستم کا شکار ہو کر بھارت آیا تھا۔ اس دعوے کے حق میں دستاویزی شواہد بھی پیش کرنا ضروری ہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ موجودہ قانون کے تحت CAA کا دائرہ صرف مخصوص غیر مسلم برادریوں تک محدود ہے اور مسلمان اس قانون کے تحت درخواست نہیں دے سکتے۔ لیکن یہاں ایک اور بنیادی سوال جنم لیتا ہے۔ اگر راج گوپال جیسے افراد جن کے خاندان کئی نسلوں سے بھارت میں آباد ہیں کسی انتظامی یا قانونی پیچیدگی کی وجہ سے اپنی شہریت ثابت کرنے کے بحران سے دوچار ہو جائیں تو کیا وہ صرف ہندو ہونے کی بنیاد پر CAA کے تحت شہریت کے لیے درخواست دے سکتے ہیں یا پھر انہیں بھی اپنی پیدائشی شہریت ثابت کرنے کے لیے اسی طویل اور پیچیدہ قانونی عمل سے گزرنا ہوگا؟ یہ وہ سوال ہے جس کا واضح جواب اب تک سامنے نہیں آیا اور یہی غیر یقینی صورتحال شہریت کے بحران کو مزید سنگین بناتی ہے۔

اب ہم اس سوال پر لوٹتے ہیں کہ پاسپورٹ کو شہریت کا ثبوت نہیں ماننے سے متعلق حکومت اور ان کے حامی میڈیا میں جو قانونی ثبوت دیے جا رہے ہیں کیا وہ درست ہیں؟ مشہور صحافی سدھارتھ وردراجن نے حکومتی ذرائع اور حکومت نواز میڈیا کے ذریعہ دیے جا رہے "پاسپورٹ ایکٹ 1967 کے سیکشن '20' کے حوالے کو مضحکہ خیز بتاتے ہوئے جو حقائق پیش کیے ہیں وہ اس کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہیں۔ وردراجن نے لکھا ہے کہ "یہ دلیل دی جا رہی ہے کہ چونکہ حکومت عوامی مفاد میں کسی غیر ملکی کو بھی پاسپورٹ جاری کر سکتی ہے، اس لیے پاسپورٹ شہریت کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ سراسر ایک قانونی دھوکہ دہی ہے۔ سیکشن 20 ایک انتہائی غیر معمولی 'استثنائی شق (Exceptional Clause) ہے جو محض انٹیلیجنس اثاثوں یا سفارتی ضرورتوں کے لیے مخصوص ہے۔ ملک کے 14 کروڑ سے زائد پاسپورٹ ہولڈرز میں سے ایسے لوگوں کی تعداد 0.0001 بھی نہیں ہوگی۔ کیا چند مٹھی بھر استثنائی معاملات کو بنیاد بنا کر ملک کے 99.9999 حقیقی شہریوں کی دستاویز کو مشکوک قرار دیا جا سکتا ہے؟ اگر حکومت کے پاس ان مخصوص لوگوں کی فہرست ہے تو وہ اپنے ڈیٹابیس میں چیک کرنے کے بجائے پورے ملک کو کٹہرے میں کیوں کھڑا کر رہی ہے؟ اسی طرح بمبئی ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا جا رہا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ "پاسپورٹ شہریت کا ثبوت نہیں ہے" سدھارتھ وردراجن اس فیصلے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس کیس میں جن چار مبینہ بنگلہ دیشی شہریوں کا معاملہ تھا ان کے پاسپورٹ عدالت میں سماعت کے وقت پہلے ہی منسوخ (Terminated) کیے جا چکے تھے۔ قانون کا بنیادی اصول ہے

کہ ایک بار جب دستاویز منسوخ ہو جائے تو وہ قانونی طور پر کالعدم ہو جاتی ہے۔ عدالت نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ایک درست اور فعال (Valid) پاسپورٹ شہریت کا ثبوت نہیں ہے۔ عدالتوں کے پرانے فیصلوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ایک مصنوعی خوف کا ماحول پیدا کیا جا سکے۔ بے زمین اور پسماندہ طبقات پر براہِ راست پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات کو شہریت کے دائرے سے باہر کرنے کا سب سے ہولناک اثر ملک کے غریبوں، دلتوں، آدیواسیوں اور مسلم اقلیتوں پر پڑے گا۔ ہندوستان کی ایک بہت بڑی آبادی ایسی ہے جس کے پاس نسل در نسل کوئی پشتینی جائیداد یا زمین کے کاغذات (LegacyData) نہیں ہیں۔ دیہی علاقوں میں گزشتہ دہائیوں تک برتھ سرٹیفکیٹ (پیدائشی سرٹیفکیٹ) بنانے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ ایسے میں اگر این آر سی (NRC) یا این پی آر (NPR) جیسے قوانین کا شکنجہ کسا جاتا ہے تو یہ غریب اور پسماندہ طبقات راتوں رات اپنے ہی وطن میں 'مشکوک اور بے وطن بنا دیے جائیں گے۔

قانون داں اور چانکیہ نیشنل لا یونیورسٹی، پٹنہ کے وائس چانسلر پروفیسر فیضان مصطفیٰ نے انگریزی اخبار دی انڈین ایکسپریس میں شائع اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "موجودہ شہریت کا بحران صرف ایک انتظامی مسئلہ نہیں بلکہ ریاست اور شہری کے تعلق سے وابستہ بنیادی آئینی سوال ہے۔ ان کے مطابق بھارتی آئین نے ابتدا میں حقِ پیدائش (Jus Soli) کو شہریت کی بنیاد بنایا تھا مگر 1986 اور 2003 کی ترامیم کے بعد قانون بتدریج حقِ نسب (Jus Sanguinis) کی طرف منتقل ہو گیا جس کے نتیجے میں شہریت کا تصور پہلے کے مقابلے میں زیادہ سخت اور پیچیدہ ہو گیا۔ وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اگر حکومت آدھار، ووٹر شناختی کارڈ، راشن کارڈ اور اب پاسپورٹ کو بھی شہریت کا قطعی ثبوت تسلیم نہیں کرتی تو یہ واضح کرنا اسی کی ذمہ داری ہے کہ آخر عام شہری اپنی شہریت کس دستاویز سے ثابت کرے۔ وہ یاد دلاتے ہیں کہ آسام میں 3 کروڑ 11 لاکھ افراد کی شہریت کی جانچ مکمل ہونے اور ان کے نام NRC میں شامل ہونے کے باوجود انہیں کوئی شہریت کا کارڈ جاری نہیں کیا گیا۔ ان کے مطابق قانون کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حکومت کے جاری کردہ سرکاری دستاویزات، خصوصاً پاسپورٹ اور ووٹر شناختی کارڈ، کم از کم شہریت کے حق میں ایک مضبوط قانونی قیاس (Presumption) پیدا کرتے ہیں اور جب تک دھوکہ دہی یا جعل سازی ثابت نہ ہو شہریت کو مشتبہ بنانے کے بجائے حکومت پر ہی اعتراض ثابت کرنے کی ذمہ داری ہونی چاہیے، نہ کہ ہر شہری کو بار بار اپنی شہریت ثابت کرنے پر مجبور کیا جائے؟ یہ دلیل اپنی جگہ مگر ایک بنیادی سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ اگر جعلی نوٹ برآمد ہونے کے باوجود پورا مالیاتی نظام مشکوک نہیں ہو جاتا، اگر جعلی ڈگریاں سامنے آنے کے باوجود تمام جامعات کی اسناد بے اعتبار نہیں سمجھی جاتیں تو پھر چند جعلی پاسپورٹوں کی بنیاد پر کروڑوں بھارتی شہریوں کے پاسپورٹ کو شہریت کے ناقابلِ اعتماد ثبوت کے طور پر کیوں دیکھا جائے؟ قانون کا اصول یہی ہے کہ جعل سازی کی ذمہ داری فرد پر عائد کی جائے، پوری آبادی پر نہیں۔

بھارتی شہری کون ہے؟

اصل سوال یہی ہے کہ آخر بھارت کا حقیقی شہری کون ہے اور اس کی شناخت کس بنیاد پر ہو گی؟ شہریت ایکٹ 1955 اس سوال کا واضح جواب دیتا ہے۔ اس قانون کے مطابق شہریت حاصل کرنے کے بنیادی راستے صرف چار ہیں: پیدائش، نسب، رجسٹریشن اور نیچرلائزیشن۔ البتہ ان تمام صورتوں میں یہ شرط بھی عائد ہے کہ متعلقہ شخص نے کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار نہ کی ہو۔ اسی قانونی فریم ورک کی بنیاد پر حکومت کسی بھی شہری کو پاسپورٹ جاری کرتی ہے۔ پاسپورٹ ایکٹ 1967 کی دفعہ 6 (2) واضح کرتی ہے کہ اگر درخواست گزار بھارتی شہری نہ ہو تو اسے پاسپورٹ جاری ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر درخواست گزار اپنے فارم میں یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ پیدائش، نسب، رجسٹریشن یا نیچرلائزیشن میں سے کس بنیاد پر بھارتی شہری ہے۔ اگر بعد میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے دھوکہ دہی یا جعلی دستاویزات کی بنیاد پر پاسپورٹ حاصل کیا ہے تو قانون کی دفعہ 10 کے تحت حکومت کو اسے منسوخ یا ضبط کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاسپورٹ جاری ہونے سے پہلے حکومت خود اس بات سے مطمئن ہوتی ہے کہ درخواست گزار شہریت ایکٹ کی شرائط پوری کرتا ہے۔ اسی اصول کو 2025 میں بامبے ہائی کورٹ نے بھی ایک اہم مقدمے میں واضح کیا۔ عدالت کے روبرو ایک ایسے شخص کا معاملہ آیا جس کے پاس آدھار، ووٹر شناختی کارڈ، پین کارڈ اور پاسپورٹ سمیت متعدد سرکاری دستاویزات موجود تھیں لیکن انتظامیہ نے اسے بنگلہ دیشی قرار دیتے ہوئے دعویٰ کیا کہ یہ تمام دستاویزات دھوکہ دہی سے حاصل کی گئی ہیں۔ جسٹس امت بور کرنے اپنے فیصلے میں کہا کہ ہندوستان میں شہریت کا فیصلہ صرف شہریت ایکٹ 1955 کے مطابق ہو گا، نہ کہ محض آدھار، ووٹر شناختی کارڈ یا دیگر شناختی دستاویزات کی بنیاد پر؟ تاہم قابلِ غور بات یہ ہے کہ عدالت نے اپنے فیصلے میں پاسپورٹ کی قانونی حیثیت پر کوئی واضح تبصرہ نہیں کیا۔

یہیں سے ایک اہم قانونی سوال جنم لیتا ہے۔ اگر کسی شخص پر دھوکہ دہی یا جعلی دستاویزات کے ذریعے پاسپورٹ حاصل کرنے کا الزام ہو تو یقیناً اس کی شہریت کی دوبارہ جانچ ہونی چاہیے۔ لیکن جب کسی شہری پر ایسا کوئی الزام ہی موجود نہ ہو تو کیا یہ قانونی قیاس نہیں ہونا چاہیے کہ حکومت کی جانب سے جاری کیا گیا پاسپورٹ اس کے بھارتی شہری ہونے کا مضبوط ثبوت ہے؟ مزید یہ کہ برتھ سرٹیفکیٹ یا دیگر ابتدائی دستاویزات میں بائیومیٹرک شناخت موجود نہیں ہوتی، جبکہ پاسپورٹ واحد سرکاری دستاویز ہے جو مکمل جانچ، پولیس تصدیق اور بائیومیٹرک معلومات کے بعد جاری کیا جاتا ہے۔ ایسے میں اگر پاسپورٹ بھی شہریت کے معتبر ثبوت کے طور پر تسلیم نہ کیا جائے تو پھر ایک عام شہری کے پاس اپنی شہریت ثابت کرنے کے لیے آخر کون سا دستاویز باقی رہ جاتا ہے؟

اسی تناظر میں ممتاز صحافی سدھارتھ وردراجن کہتے ہیں کہ مسئلہ صرف پاسپورٹ کا نہیں بلکہ اس پورے نظام کا ہے جس میں ریاست اپنے ہی جاری کردہ کسی بھی دستاویز کو حتمی ثبوت ماننے پر آمادہ نہیں۔ ان کے مطابق اگر پاسپورٹ، آدھار، ووٹر شناختی کارڈ اور دیگر سرکاری دستاویزات بھی ناکافی قرار پائیں تو شہریت ایک قانونی حق کے بجائے ایک ایسا انتظامی عمل بن جاتی ہے جس میں ہر مرحلے پر شہری سے نئے نئے ثبوت طلب کیے جا سکتے ہیں۔ وہ طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں کہ اگر پیدائش کا سرٹیفکیٹ بھی پیش کر دیا جائے تو شاید اگلا مطالبہ یہ ہو کہ اپنی پیدائش کی ویڈیو یا اپنے والدین کی شہریت کے مزید ثبوت فراہم کیے جائیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بھارت جیسے 140 کروڑ کی آبادی والے ملک میں ایسا نظام نہ صرف عملی طور پر ناقابلِ عمل ہے بلکہ اس سے شہریت کا سوال ایک محدود انتظامی کارروائی کے بجائے کروڑوں شہریوں کے بنیادی حقوق کا مسئلہ بن جاتا ہے۔

سیاسی مقاصد اور شہریت کا بحران

بھارتی سیاست کے ناقدین کا کہنا ہے کہ گزشتہ ایک دہائی سے زیادہ عرصے کی حکمرانی کے بعد بی جے پی اور اس کے نظریاتی حلقوں کے لیے نئے سیاسی موضوعات کی ضرورت پہلے سے زیادہ محسوس کی جا رہی ہے۔ ان کے مطابق رام مندر، دفعہ 370 کی منسوخی، تین طلاق اور یکساں سول کوڈ جیسے دیرینہ سیاسی وعدوں پر بڑی حد تک پیش رفت کے بعد حکومت کو اب ایک ایسے بیانیے کی تلاش ہے جو آئندہ برسوں میں بھی سیاسی طور پر مؤثر ثابت ہو سکے۔ ناقدین کے نزدیک اسی تناظر میں "دراندازی" اور "آبادیاتی تبدیلی" (Demographic Change) جیسے موضوعات کو مسلسل قومی مباحثے کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔ اسی سلسلے میں وزیر اعظم نریندر مودی نے اپنے یومِ آزادی کے خطاب میں آبادیاتی تبدیلی کے مسئلے کو نمایاں انداز میں اٹھایا جبکہ بعد ازاں حکومت نے ڈیموگرافی کمیشن کے قیام کا اعلان بھی کیا۔ تاہم اس کمیشن کی تشکیل پر بھی سوالات اٹھے، کیونکہ اس میں آبادیات کے کئی معروف ماہرین کو شامل نہیں کیا گیا۔ ناقدین کا استدلال ہے کہ اگر "دراندازی" کو ملک کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑا مسئلہ بنا کر پیش کیا جائے تو اس کے نتیجے میں شہریت کی جانچ کا دائرہ بتدریج وسیع ہو سکتا ہے اور کروڑوں شہریوں پر اپنی شہریت ثابت کرنے کی ذمہ داری عائد کی جا سکتی ہے۔

یہ خدشہ اس لیے بھی اہم ہے کہ بھارت میں کروڑوں ایسے شہری موجود ہیں جن کے پاس نہ پشتینی جائیداد کے کاغذات ہیں، نہ برتھ سرٹیفکیٹ اور نہ ہی کئی دہائیوں پرانے سرکاری ریکارڈ۔ ایسے حالات میں اگر شہریت کے ثبوت کا معیار مزید سخت کیا جاتا ہے تو اس کا سب سے زیادہ اثر سماج کے غریب، پسماندہ، دیہی اور محروم طبقات پر پڑ سکتا ہے جو پہلے ہی دستاویزی سہولتوں سے محروم رہے ہیں۔ حکومت کے ناقدین کا یہ بھی کہنا ہے کہ شہریت سے متعلق یہ مباحثہ صرف قانونی یا انتظامی نہیں بلکہ سیاسی بھی ہے۔ ان کے مطابق "آبادیاتی تبدیلی" کا بیانیہ ایک طرف اقلیتوں اور بعض کمزور طبقات میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف اکثریتی طبقے کے ایک حصے کو یہ یقین دلاتا ہے کہ حکومت قومی سلامتی اور غیر قانونی ہجرت کے مسئلے پر سخت موقف اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس طرح شہریت کا سوال محض آئینی اور قانونی بحث تک محدود نہیں رہتا بلکہ انتخابی سیاست اور عوامی بیانیے کا ایک اہم موضوع بھی بن جاتا ہے۔ اگرچہ حکومت ان اقدامات کو قومی سلامتی، ووٹر فہرستوں کی شفافیت اور غیر قانونی ہجرت کی روک تھام کے لیے ضروری قرار دیتی ہے لیکن بنیادی سوال اپنی جگہ برقرار ہے۔ کیا ایسے اقدامات سے واقعی غیر قانونی تارکینِ وطن کی نشاندہی ہو گی یا پھر کروڑوں جائز شہری بھی اپنی شناخت اور شہریت ثابت کرنے کے ایک طویل، پیچیدہ اور غیر یقینی عمل میں الجھ جائیں گے؟ اگر ریاست کے جاری کردہ آدھار، ووٹر شناختی کارڈ، راشن کارڈ، پاسپورٹ اور حتیٰ کہ NRC میں شامل نام بھی شہریت کا ناقابلِ تردید ثبوت نہیں، تو پھر ایک عام بھارتی شہری آخر کس دستاویز کے ذریعے خود کو اس ملک کا شہری ثابت کرے گا؟ یہ سوال صرف قانون کا نہیں بلکہ ہندوستانی جمہوریت، شہری آزادی اور ریاست پر عوام کے اعتماد کا بھی ہے۔ یہی وہ سوال ہے جس پر آنے والے برسوں میں ہندوستان کی سیاست، عدلیہ اور جمہوریت کا ایک بڑا امتحان منحصر ہو گا۔

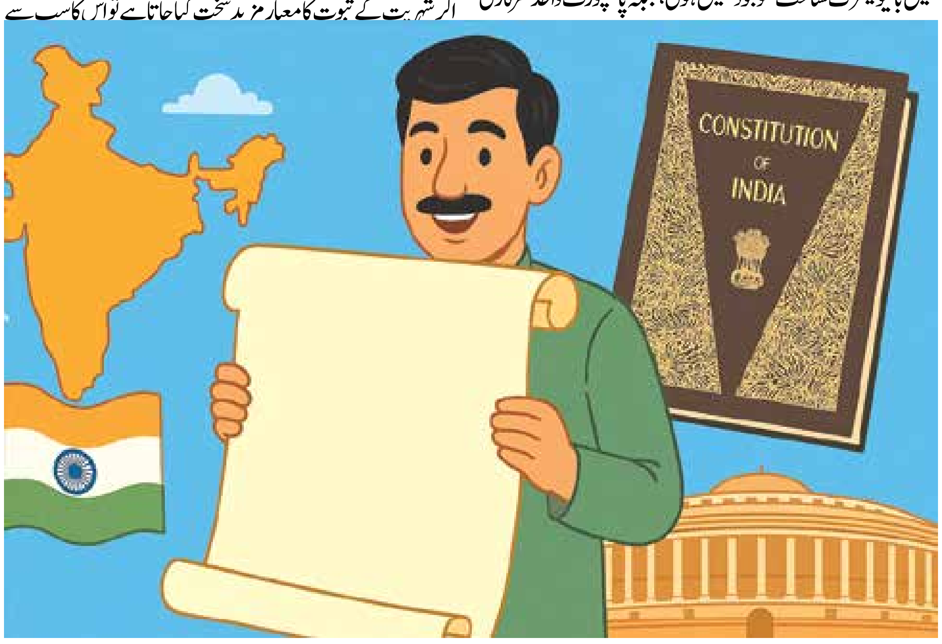

> شہریت کے موجودہ بحران کو اگر اسپیشل انٹینسیو ریویژن (SIR) قومی رجسٹر برائے شہریت (NRC) شہریت ترمیمی قانون (CAA) اور نیشنل پاپولیشن رجسٹر (NPR) جیسے اقدامات کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک وسیع تر تصویر سامنے آتی ہے۔ ناقدین کے مطابق یہ تمام اقدامات محض الگ الگ انتظامی یا قانونی فیصلے نہیں بلکہ شہریت کی جانچ کے ایک ایسے نظام کی تشکیل کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں ہر شہری سے اپنی شناخت اور شہریت ثابت کرنے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

مساجد پر یکطرفہ کارروائیوں کے خلاف راجستھان میں ہندو۔مسلم اتحاد کی نئی لہر

اسلامی اخلاقیات اور اجتماعی ذمہ داری کے تصور کو اجاگر کرنے والی کتاب

ڈاکٹر خالد ملا

ملک میں آئے دن خبروں میں یہی بات چھائی رہتی ہے کہ جگہ جگہ دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ ایک طرح کی نفرت اور دشمنی چھائی ہوئی ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا جب فرقہ وارانہ منافرت آپسی ٹکراؤ سے متعلق معاملات اور واقعات پڑھنے اور سننے کو نہیں ملتے۔ عوام تو عوام، سیاست داں، پولیس اور انتظامیہ سبھی سماج میں کسی نہ کسی بہانے سے پھوٹ ڈالنے کا کام کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔

بھارتی مسلمانوں کی جان ومال عزت و آبرو اور شناخت سے لے کر ان کی عبادت گاہوں تک کو آئے دن نشانہ بنایا جا رہا ہے لیکن اس بات کا درد اب ملک کی اکثریتی قوموں میں بھی اٹھنے لگا ہے۔ دراصل ہند۔پاک سرحد پر واقع اضلاع باڑمیر اور جیسلمر

راجستھان کے سرحدی علاقوں میں "سرودھرم شانتی سبھا" بینر تلے ہندو۔مسلمانوں کی مشترکہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی مہم کے حوصلہ افزا مناظر

کے لوگوں نے مسجدوں پر بلڈوزر کارروائی کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے۔ سرودھرم شانتی سبھا یعنی ہمہ مذہبی پرامن اجتماع کے بینر تلے ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک متحدہ آواز بلند کی ہے۔ باڑمیر میں تمام اقوام ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پر اتر آئے اور یکطرفہ وجانبدارانہ صرف مسلمانوں کے دکانات، مکانات اور عبادت گاہوں کو نشانہ بنانے کے خلاف مارچ نکالا۔ سب لوگوں نے مل کر انتظامیہ کو ایک مشترکہ یادداشت دی اور مساجد اور مقدس مقامات پر کارروائی کے معاملہ میں مکمل قانونی اور ضابطے کی کارروائی کو اختیار کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ تعصب اور منافرت کے گھٹاٹوپ اندھیروں کے بیچ مذہبی مقامات اور عبادت گاہوں کو بچانے کے لیے جو کچھ کارروائیاں کی جا رہی ہیں ان کو ملک کے تمام انصاف پسند عوام اب بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ پاردیا گاؤں کے سرپنچ سورتا رام میگھوال نے بذات خود اس احتجاج کی قیادت کی ہے۔ میگھوال نے انہدامی کارروائی کے جواز پر بھی سوال کھڑے کر دیے ہیں۔ میڈیا سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "یہ انہدامی کارروائیاں یقینی طور پر قانون کے دائرے سے تجاوز کر کے اور ضابطہ کے مراحل طے کیے بغیر انجام دی جا رہی ہیں۔ اگر مسجدوں کی جانچ ہو رہی ہے اور انہیں گرایا جا رہا ہے تو اسی پیمانے کے تحت مندروں کی بھی تفتیش ہونی چاہیے۔ اس سرحدی علاقہ میں متعدد مسجدوں کو گرایا جا چکا ہے جس نے یہاں کے باشندوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ سرپنچ میگھوال کا کہنا ہے کہ ہم نے باڑمیر میں انہدامی کارروائیوں کے خلاف احتجاج کیے تاکہ پرامن طریقہ سے ہم اپنا پیغام پہنچا سکیں اور ہم بلڈوزر ایکشن کی مخالفت بھی کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سرودھرم شانتی سبھا کے تحت یکطرفہ کارروائیوں کے خلاف جس انداز سے سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اس سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی دیکھنے کو مل رہی ہے۔ ہمارے احتجاجوں کے باعث اور زیادہ بھائی چارگی دیکھی جا رہی ہے جو کہ ہمیشہ سے ہماری روایت اور شناخت رہی ہے۔ لوگ جوق در جوق امن اور انصاف کے حق میں آگے آ رہے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ایسے تنازعات حل کرنے کا اب وقت آ گیا ہے" میگھوال کو لگتا ہے کہ اب عوامی دباؤ ہی کے تحت میمورنڈم کے ذریعہ سے اجاگر کی گئی تشویش پر انتظامیہ کان دھرے گی۔ میگھوال دوبار سرپنچ منتخب ہو چکے ہیں۔ وہ دعوے سے کہتے ہیں کہ "میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ ہمارے علاقہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین کسی طرح کا معاملہ ہی نہیں، جو کچھ نظر آتا ہے وہ ایک سیاسی کھیل ہے اور راجستھان کے عوام کے بیچ اتحاد کو توڑنے میں انہیں منہ کی کھانی پڑے گی کیونکہ ہم متحدہ طور پر ہمارے مسلم بھائیوں کی ہر حال میں پشتی بانی کرتے رہیں گے۔ میگھوال نے سوال کیا کہ صرف مسلمانوں کے مذہبی مقامات ہی کو کیوں نشانہ بنایا جا رہا ہے اور ایسا کرتے وقت آخر کونسے قانونی عمل کے ساتھ انصاف کیا جا رہا ہے؟ احتجاج میں شریک ہونے والے ایک شہری گووند بھارگو کا کہنا ہے کہ ہم سبھی کے ساتھ یکساں برتاؤ کا مطالبہ کرتے ہیں اور جیسلمیر میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے سڑکوں پر اتر آئے ہیں۔ اسی طرح اودارام میگھوال بتاتے ہیں کہ "ہم گاؤں میں نسلوں سے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں اور یہ بات مذہب سے جڑی ہوئی نہیں ہے بلکہ معاملہ ہمارے گاؤں اور ہم آہنگی کا ہے۔ اگر کوئی مسجد ڈھائی جاتی ہے اور مسلمان تشویش میں مبتلا ہوتے ہیں تو گاؤں کا ہر باشندہ ایسی جانبدارانہ کارروائیوں سے دکھی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ باہر ہمیں ہندو یا مسلمان کے طور پر دیکھا جاتا ہے لیکن ہمارے علاقہ میں ہم سب مل جل کر تیوہار مناتے ہیں، ایک دوسرے کے مشکل وقت میں ساتھ کھڑے بھی ہوتے ہیں اور ہم اپنی اس روایت کو بچانے کے لیے پھر ایک بار ساتھ آئے ہیں۔ کسی بھی قیمت پر ہمیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ درگاہوں، مساجد اور مدرسوں پر کارروائیوں سے ہند-پاک سرحد پر تناؤ یا ٹکراؤ کے بجائے ہم لوگوں نے سیاست کے مقابلے میں انصاف اور امن پسندی کو ترجیح دی ہے۔ تفرقہ کے مقابلے میں اتحاد مضبوط ہوا ہے۔ احتجاجیوں نے بیک زبان یہ پیغام دیا ہے کہ حکومت اور انتظامیہ ان کارروائی کو ناجائز قبضوں کے خلاف ایک معمول کی کاروائی قرار دیتی ہے لیکن مقامی باشندوں سے بات چیت کے بغیر اور ضابطے کی قانونی کاروائیوں کو مکمل کیے بغیر کسی بھی مذہبی عبادت گاہ کو ہرگز گرانے نہیں دیا جائے گا۔ ایک انتہائی قدیم مزار کو جس طرح سے گرایا گیا اس نے دیہاتوں کی روایتی ہم آہنگی اور بھائی چارگی کو غیرت دلانے کا کام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سوشل میڈیا پر اس طرح کے مثبت اقدامات کو بھی غلط طریقہ سے پیش کیا جاتا ہے سو وہ یہاں بھی ہوا۔ بھارگو کہتے ہیں کہ لوگ چاہے جو کہتے رہیں ہم اپنی کوششیں کرتے رہیں گے۔ ہمیں تو بس امن اور اتحاد چاہیے۔ سماج میں ماحول خراب کرنے کا کام یہاں نہیں ہو پائے گا۔ احتجاجوں کے ساتھ ساتھ قانونی راستے بھی اختیار کیے جاتے رہیں گے۔ سوشل میڈیا ٹرول آرمی کے مقابلے میں سپریم کورٹ کے معروف وکیل سنجے ہیگڑے دیہات میں ان کی اس مہم کی حمایت میں کھڑے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ٹویٹر پر لکھا "اس ہندو-مسلم بکواس سے لوگ اب اکتانے لگے ہیں۔ حالانکہ سرکاریں ان کی جیبوں پر ڈاکے ڈال رہی ہیں۔ سماجی جہد کار تیستا سیتلواد نے بھی ٹویٹر پر سوال اٹھایا کہ قومی میڈیا کہاں ہے؟ جہاں کہیں حقیقی سیکولرازم اور ہم آہنگی نظر آتی ہے تو وہ سرمایہ دار کارپوریٹ میڈیا کے بیانیہ سے باہر کر دیا جاتا ہے۔ گاؤں والوں کے اس اظہار یکجہتی کے بعد مقامی اور ریاستی مسلم قائدین نے خیر مقدم کیا ہے۔ جماعت اسلامی ہند حلقہ راجستھان کے امیر حلقہ جناب نظام الدین نے کہا ہے کہ ہندو-مسلم یکجہتی کے بعد بلڈوزر ایکشن مدھم پڑ گیا ہے اور انتظامیہ بھی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی ہے۔ حالانکہ مسجدوں پر خطرہ کے بادل اب بھی منڈلا رہے ہیں۔

بتا دیں کہ راجستھان کی انتظامیہ اور سیکوریٹی ایجنسیوں نے مل کر ہند-پاک سرحد اور خاص کر باڑمیر اور جیسلمیر سیکٹر میں بہت بڑے پیمانہ پر مبینہ ناجائز قبضوں کے خلاف مہم شروع کر رکھی ہے جسے آپریشن 'جھاڑو' کا دلفریب نام دیا گیا ہے لیکن مذہبی مقامات اور کارروائیوں کے دوران ضابطوں کو صرف مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے سے سماجی کارکنوں کے بیچ انتظامیہ کے خلاف خاصی ناراضگی پائی جا رہی ہے۔ حال ہی میں اسوسی ایشن فار پروٹیکشن آف سِول رائٹس (اے پی سی آر) نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ راجستھان میں مسلم اکثریتی علاقوں میں 350 مساجد کو نوٹسیں جاری کی گئی ہیں۔ اے پی سی آر کے جنرل سکریٹری ندیم خان نے سوال اٹھایا ہے کہ کیا ایسی نوٹسیں مندروں کو بھی بھیجی گئی ہیں جبکہ آزادی کے وقت سے ہی یہ مسجدیں موجود ہیں اور کبھی بھی سرحد کے اس حصہ میں سیکوریٹی کا خطرہ نہیں پیدا ہوا؟

واضح ہو کہ راجستھان کے جیسلمیر، باڑمیر، سری گنگا نگر اور بیکانیر اضلاع پر مشتمل 1050 کلو میٹر طویل سرحد پائی جاتی ہے جہاں بھارت کی مغربی سرحد پر یہ آپریشن جھاڑو چلایا جا رہا ہے۔ دوسری جانب ملک گیر مشرقی سرحد واقع آسام اور مغربی بنگال پر بھی PushBack پالیسی کے تحت "detect,delete,anddeport" یعنی پتہ لگاؤ، ہٹاؤ اور ملک بدر کرو والی مہم جاری ہے۔ پچھلے دنوں قریب دس ہزار بنگلہ بولنے والے بھارتی شہریوں کو دستاویزات مکمل نہ ہونے کے بہانے سے سرحد پار دھکیل دیا گیا ہے جبکہ تقریباً 1800 بنگلہ زبان بولنے والوں پر ملک بدری کا خطرہ منڈلا رہا ہے اور بنگلہ دیش ان لوگوں کو اپنا شہری تسلیم کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ ادھر آسام میں 350 کے قانون کے تحت اور سپریم کورٹ کے 6 اے سیکشن پر دیے فیصلوں کے تحت آسام سے لوگوں کو باہر کرنے کا کام کیا جا رہا ہے۔ میڈیا کی رپورٹوں کے مطابق مغربی بنگال میں ممتا بنرجی حکومت کو بے دخل کر کے بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے بعد تقریباً پانچ ہزار بنگلہ زبان بولنے والے شہریوں کو ملک بدر کیا گیا ہے جن پر الزام ہے کہ ان کے پاس نہ صرف شہریت ثابت کرنے کے مکمل دستاویز موجود نہیں تھے۔ بتا دیں کہ مغربی بنگال میں ہندوستان اور بنگلہ دیش کے درمیان 4097 کلو میٹر طویل سرحد پائی جاتی ہے۔ جس میں 3240 کلو میٹر سرحد پر باڑھ لگائی گئی ہے جبکہ 857 کلو میٹر طویل سرحد کھلی ہوئی ہے۔ سرکاری دعوؤں کے مطابق ہند-بنگلہ دیش سرحد پر تقریباً 1104 دراندازی کی کوششیں ہوئی ہیں۔ جنوری تا نومبر 2025 کے دوران وزارت داخلہ کے مطابق 2500 گرفتاریاں غیر قانونی سرحد عبور کرنے کے الزام میں ہو چکی ہیں۔ جس سے دونوں ممالک کے درمیان اب تک تعلقات ہموار نہیں ہو پائے ہیں۔ مغربی بنگال حکومت نے ایسے مشکوک شہریوں کے لیے Holding Centres یعنی روک رکھنے والے مراکز قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ بنگلہ دیش سرحد پر کریک ڈاؤن کے نتیجہ میں بڑی تعداد میں لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔

بلاتبصرہ

جولائی 2025 میں پارلیمنٹ میں 'آپریشن سندور' کے حوالے سے بات کرتے ہوئے وزیر دفاع راج ناتھ سنگھ نے کہا تھا:

اگر آپ کوئی سوال پوچھنا چاہتے ہیں تو پوچھیں کہ کیا' اس آپریشن میں ہمارے بہادر سپاہیوں کا کوئی جانی "نقصان ہوا؟

اور اس کا جواب ہے "نہیں"۔

جبکہ حکومت ہند نے آپریشن سندور کے دوران شہید ہونے والے چھ بہادر فوجیوں کی فہرست ہی جاری کر دی ہے۔

میجر پون کمار
رائفل مین سنیل کمار
لانس نائک دنیش کمار
ایوی ایشن ٹیکنیشن مرلی نائک
حوالدار سنیل سنگھ
(IAF) سریندر کمار

راج ناتھ سنگھ وزیر دفاع ہیں۔ وہ ملک کے سب سے زیادہ ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں، جس سے 1.4 بلین (1 ارب 40 کروڑ) ہندوستانیوں کے جذبات وابستہ ہیں۔

انہیں ایسا بیان نہیں دینا چاہیے تھا۔ ملک کے سپاہی شہید ہوئے، وزیر دفاع نے جھوٹ بولا اور ان کے ساتھی میزیں ٹھونک کر تالیاں بجا رہے تھے۔

جیکی یادو صحافی

گجرات کے کانڈلا، کچھ میں مسجد پر بلڈوزر کارروائی

ہند۔پاک سرحد پر واقع علاقے Kandla میں قدیم مسجد پر بلڈوزر چلا دیا گیا

راجستھان کے ساتھ ساتھ پڑوسی ریاست گجرات کے ساحلی اور سرحدی علاقوں میں مساجد، درگاہوں (مزارات) اور مسلمانوں کی بستیوں کے خلاف بلڈوزر استعمال کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ کچھ کی "جونا کنڈلا" مسجد، جسے ایک بلڈوزر سے منہدم کر دیا گیا، 1965 سے وقف املاک کے طور پر رجسٹرڈ تھی!

سیکورٹی کے نام پر مسلمانوں کے مذہبی مقامات کو نشانہ بنانا تشویشناک ہے۔

مقامی صحافی سہل قریشی نے ہمیں بتایا کہ حکومتیں دہرا معیار اپنا رہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "اگرچہ واقعی غیر قانونی تجاوزات کو سپریم کورٹ کے رہنما خطوط کے مطابق ہٹایا جانا چاہئے، لیکن ایک ایسا ماحول بنایا گیا ہے کہ صرف مسلمان ہی تجاوزات میں ملوث ہوں۔ درحقیقت، ملک بھر میں مندروں اور ہندو بستیوں پر مشتمل تجاوزات کی سب سے زیادہ تعداد نظر آتی ہے، پھر بھی جب مسلمانوں کی بات آتی ہے تو حکومت ایک مختلف معیار کا اطلاق کرتی نظر آتی ہے!"

بھاشا کی شدھی کا پرشن

بسلسلہ صفحہ نمبر-20

ہے۔ قدیم ہندوستان، ایران اور یونان کے مذہبی رسوم و رواج میں آگ مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ ایران میں آتش کدوں کی روایت معروف ہے، جبکہ ویدک مذہب میں یگیہ کے لیے اگنی بنیادی حیثیت رکھتی تھی۔ قدیم ہندوستان میں تدفین کا رواج موجود تھا، لیکن بعد کے ادوار میں مردوں کو جلانے کی روایت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے جسے بعض ماہرین ویدک روایات کے ہندوستان آمد سے جوڑتے ہیں۔ ہومر کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ یونانیوں کے یہاں مردوں کو کس پروٹوکول کے ساتھ جلایا جاتا تھا۔ اسی طرح گھوڑا بھی ان روایات میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں مورخین نے اشومیدھ یگیہ کا تذکرہ کیا ہے جس میں گھوڑے کی قربانی کی جاتی تھی۔ آج گھوڑوں کی قربانی اور ان کے گوشت کھانے کا رواج مرکزی ایشیائی ممالک میں زیادہ ہے۔

طوالت کے باعث اس قسط کو یہیں پر روکتے ہیں۔ مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں چند سوالات سامنے آتے ہیں۔ کیا آریہ لسانی گروہ ہندوستان سے دنیا کے دوسرے حصوں میں پھیلا یا یوریشیا کے کسی دوسرے خطے سے برصغیر آیا؟ کیا صرف لسانیات اس سوال کا جواب دینے کے لیے کافی ہے؟ اگر بڑی انسانی آبادیاں ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل ہوئیں تو کیا ان کے کوئی مادی شواہد بھی ملتے ہیں اور ان کے اثرات جینیات میں بھی محفوظ رہتے ہیں؟ اس سلسلے میں ماہرین آثار قدیمہ جینیات ہماری کیا رہنمائی کرتے ہیں؟ نیز بعد کے ادوار میں زبانوں میں کیا تبدیلیاں آئیں؟ ان شاءاللہ اس سلسلہ وار مضمون کی اگلی قسط میں انہی سوالات کا جائزہ لیا جائے گا۔

ماخذ و مطالعہ:

1-Archaeology and Language: The Puzzle of Indo-European Origins, Colin Renfrew, Penguin Books
2-Which of Us Are Aryans, Romila Thapar, Aleph Books
3-India's Ancient Past, R.S. Sharma, Oxford University Press
4-The Penguin History of Early India, Romila Thapar, Penguin Books
5-Pracheen Bharat, R.C. Majoomdar, Motilal Banarsidas Publisher
6-A People's History of India, Irfan Habib, Tulika Books.
7-Sanskrit and the British Empire, Rajesh Kocchar, Routledge
8-The Vedic People, Their History and Geography, Rajesh Kocchar, Orient BlackSwan
9-The Early History of India, Vincent Arthur Smith, Oxford University Press
10-Al Jihad fil Islam, S.A.A Maudoodi, MMI Publishers
11-Iliad & Odyssey, Homer.
12-https://www.britannica.com/

دعوت ہفت روزہ نئی دہلی
DAWAT, NEW DELHI
www.dawatnews.net

بنگال میں 'ایس آئی آر' اور آسام میں آدھار کا تنازع

کیا غریب فلاحی اسکیموں سے محروم ہو جائیں گے؟

شناخت کی سیاست اور بنیادی حقوق کا تصادم: بنگال اور آسام کی صورتحال پر ایک خاص رپورٹ

بغیر ووٹ، بغیر آدھار: کیا ملک میں ایک نیا 'بے وطن' اور بے آواز طبقہ جنم لے رہا ہے؟

ابو عفان قاسمی

رواں ہفتے 23 جون کو سپریم کورٹ میں 'پچھم بنگا کھیت مزدور سمیتی کی اس عرضی پر سماعت ہوئی جس میں بنگال حکومت کے ذریعہ ایس آئی آر (SIR) کو غذائی تحفظ کی اسکیموں سے جوڑنے کے فیصلے کو چیلنج کیا گیا تھا۔ جسٹس بی وی ناگرتنا اور جسٹس جے مالیا باگچی کے بنچ نے اس پر فوری سماعت کرنے سے انکار کرتے ہوئے عرضی گزاروں کو کلکتہ ہائی کورٹ سے رجوع کرنے کی ہدایت دی اور فی الوقت معاملے کو نمٹا دیا ہے۔ واضح رہے کہ ایس آئی آر کے سائے میں ہونے والے حالیہ اسمبلی انتخابات میں بڑی جیت حاصل کرنے والی نئی بی جے پی حکومت نے 'انا پورنا یوجنا اسکیم کے لیے ایک نوٹیفکیشن جاری کیا ہے۔ اس سے قبل، سابقہ ترنمول کانگریس کی حکومت 'لکشمی بھنڈار اسکیم کے تحت خواتین کو ہر ماہ پندرہ سو روپے دیتی تھی جسے نئی حکومت نے تبدیل کرتے ہوئے 'ڈائریکٹ بینیفٹ ٹرانسفر (DBT) کے ذریعے تین ہزار روپے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاہم، اس نئے نوٹیفکیشن میں شرط رکھی گئی ہے کہ جن لوگوں کے نام ایس آئی آر کے تحت انتخابی فہرستوں سے خارج کر دیے گئے ہیں، وہ اس اسکیم سے مستفید نہیں ہو سکیں گے۔ اس کے بعد 4 جون کو حکومت کے ایک اور حکم نامے نے پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم (PDS) یعنی راشن کے فوائد تک رسائی کے لیے بھی ووٹر لسٹ میں نام کی موجودگی کو لازمی شرط بنا دیا۔ سرکاری ویب سائٹ کے مطابق، ریاست مغربی بنگال میں پی ڈی ایس سے مستفید ہونے والے افراد کی تعداد 8.89 کروڑ سے زیادہ ہے۔ حالانکہ دونوں نوٹیفکیشنز میں کہا گیا ہے کہ جن لوگوں نے ایس آئی آر ٹریبونلز کے سامنے اپیلیں دائر کر رکھی ہیں یا شہریت ترمیمی ایکٹ (CAA) کے تحت درخواستیں جمع کرائی ہیں انہیں معاملات کا حتمی فیصلہ ہونے تک مالی امداد ملتی رہے گی۔

ایس آئی آر کے تحت بنگال میں تقریباً 34 لاکھ ایسے ووٹرز ہیں جنہیں "منطقی تضادات" (LogicalDiscrepancies) کی بنیاد پر ووٹر لسٹ سے خارج کیا گیا ہے۔ یہ لاکھوں افراد نہ صرف اپنے حقِ رائے دہی سے محروم ہوئے اور اسمبلی انتخابات میں ووٹ نہیں ڈال سکے بلکہ اب اس کے اثرات ان کی روزمرہ زندگی کے دیگر معاملات پر بھی پڑ رہے ہیں۔

حال ہی میں ملک کے مشہور انگریزی اخبار "دی ٹیلی گراف" کے سابق ایڈیٹر راج گوپال (جن کے والد ایک معروف گاندھیائی شخصیت اور حکومتِ ہند کے سابق اعلیٰ افسر رہ چکے ہیں) کا

ایک چونکا دینے والا معاملہ سامنے آیا۔ ووٹر فہرست میں نام نہ ہونے کی بنیاد پر ان کا نام بھی خارج کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس سال ووٹ نہیں ڈال سکے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ مارچ میں ان کے پاسپورٹ کی مدت ختم ہو گئی تھی اور انہوں نے تجدید (Renewal) کے لیے پاسپورٹ محکمے سے رابطہ کیا، مگر سو دن سے زائد کا وقت گزر جانے کے باوجود اب تک ان کا پاسپورٹ رینیو نہیں ہو سکا۔ کیونکہ ووٹر لسٹ میں نام نہ ہونے کی وجہ سے پولیس ویریفکیشن میں ان سے متعلق منفی (Negative) رپورٹ بھیج دی گئی۔ اس کا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ وہ اپریل میں امریکہ میں ہونے والی اپنی بیٹی کی شادی میں بھی شریک نہ ہو سکے، جبکہ ان کے پاسپورٹ پر پہلے ہی دس برس کا امریکی ویزا موجود تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب راج گوپال جیسی معروف شخصیت، جن کی رسائی اعلیٰ ایوانوں تک ہے، اس طرح کے بحران کا سامنا کر رہی ہے تو ان عام شہریوں کو کن مشکلات سے گزرنا پڑ رہا ہوگا جن کے نام فہرستوں سے نکالے گئے ہیں؟ اب عام لوگوں کو بینکوں سے لون دینے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ مغربی بنگال جیسی ریاست میں، جہاں دیہی علاقوں میں غربت کی شرح زیادہ ہے اور جن کی زندگی کا دارومدار راشن اور دیگر فلاحی اسکیموں پر ہے، وہاں یہ صورتحال انتہائی سنگین ہو چکی ہے۔

ووٹر لسٹ سے خارج کیے گئے ناموں کے معاملات کو حل کرنے کے لیے ریاست میں 19 ٹریبونلز قائم کیے گئے ہیں، جن میں کئی سابق ججز شامل ہیں۔ الیکشن کمیشن کے فراہم کردہ ڈیٹا کے مطابق 14 مئی تک ان 19 میں سے 12 ٹریبونلز نے جن مقدمات کا فیصلہ کیا، ان میں دائر کی گئی کل اپیلوں میں سے مجموعی طور پر صرف 430,4 اپیلیں ہی منظور کی جا سکیں، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حل شدہ کیسز میں سے محض 16.5 فیصد لوگوں کے نام ہی دوبارہ انتخابی فہرستوں میں شامل ہو پائے ہیں۔ دوسری طرف 1267 اپیلیں خارج کر دی گئی ہیں، جبکہ بقیہ 1200 سے زائد نمٹائے گئے کیسز کی اصل قانونی صورتحال سرکاری اعداد و شمار سے واضح نہیں ہو سکی۔

شکایات کے ازالے کا یہ نظام ریاست بھر میں شدید انتظامی و ساختی چیلنجز اور علاقائی عدم توازن کی وجہ سے مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر کولکاتا شمال اور کولکاتا جنوب کے علاقوں کو سنبھالنے والے مشترکہ ٹریبونل کا کام اس وقت مکمل طور پر ٹھپ ہو گیا جب اس کے سربراہ اور کلکتہ ہائی کورٹ کے سابق چیف جج، جسٹس ٹی ایس سیوا گنم نے ذاتی وجوہات کا حوالہ دیتے ہوئے اچانک استعفیٰ دے دیا۔ اس ٹریبونل کے پاس اس وقت 15,000 سے زائد زیر التوا (Pending) اپیلوں کا ایک بہت بڑا بیک لاگ موجود ہے۔ اب تک کولکاتا نارتھ اور ساؤتھ میں مشترکہ طور پر صرف 1,777 کیسز کا تصفیہ ہو سکا ہے، جو کہ کل زیر التوا مقدمات کا محض 2.7 فیصد ہے۔

ریاست کے سرحدی اضلاع میں یہ بحران مزید سنگین شکل اختیار کر چکا ہے۔ ضلع مرشد آباد میں دائر کی جانے والی 96.2 لاکھ سے زائد اپیلوں میں سے اب تک محض 112 اپیلوں کا ہی باضابطہ تصفیہ کیا گیا ہے، جبکہ پڑوسی ضلع مالدہ میں 95.2 لاکھ سے زائد اپیلوں میں سے صرف 185 کیسز ہی نمٹائے جا سکے ہیں۔ حکام کے مطابق ان اپیلوں کی سماعتیں آن لائن اور آف لائن دونوں طریقوں سے کی جا رہی ہیں، تاہم درخواست گزاروں کی ذاتی یا جسمانی پیشی (Physical Appearance) کے مواقع اب بھی انتہائی محدود ہیں۔ اگرچہ گزشتہ ایک مہینے میں ان اعداد و شمار میں معمولی تبدیلی آئی ہے، لیکن شکایات کو نمٹانے کی موجودہ رفتار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس پورے عمل کو مکمل ہونے میں کئی دہائیاں صرف ہو جائیں گی۔

ایس آئی آر کو فلاحی اسکیموں سے جوڑے جانے کی وجہ سے ملک میں ایک نئی قانونی بحث شروع ہو گئی ہے۔ سپریم کورٹ نے بہار میں ایس آئی آر کی آئینی حیثیت کا فیصلہ کرتے ہوئے واضح کہا تھا کہ ووٹر لسٹ سے نام خارج ہونا شہریت کا حتمی تعین نہیں ہے۔ 27 مئی کو عدالت نے الیکشن کمیشن آف انڈیا (ECI) کو ہدایت کی تھی کہ وہ حذف شدہ افراد کے معاملات کو شہریت ایکٹ 1955 کے تحت مجاز اتھارٹی کو فیصلے کے لیے بھیجے۔ چونکہ حذف کیے گئے افراد کی شہریت پر کسی مجاز اتھارٹی کی طرف سے اب تک نہ تو کوئی سوال اٹھایا گیا ہے اور نہ ہی کوئی رسمی فیصلہ ہوا ہے، اس لیے انہیں فلاحی اسکیموں کے لیے نااہل قرار دینے کے اقدام نے سنگین آئینی خدشات کو

بے وطن طبقہ بننے کا خدشہ (Stateless)

سیاسی ماہرین اور رہنماؤں نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر بنگال اور آسام میں 'ایس آئی آر اور آدھار کی یہ مشق اسی طرح جاری رہی تو ملک کے اندر ایک ایسا بہت بڑا مظلوم طبقہ پیدا ہو جائے گا جو نہ صرف ووٹ کے حق سے محروم ہوگا بلکہ عملاً اپنے ہی ملک میں 'بے وطن اور بے آواز بن جائے گا۔

آدھار ایکٹ کی ہدایات کیا کہتی ہیں؟

آدھار ایکٹ کے سیکشن 3(1) کے مطابق بھارت کا ہر وہ 'رہائشی آدھار حاصل کرنے کا حقدار ہے جو درخواست دینے سے قبل 12 مہینوں کے دوران کم از کم 182 دن بھارت میں رہا ہو۔

قانون میں آدھار کے لیے عمر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، یہاں تک کہ ایک نوزائیدہ بچہ بھی اس کا اہل ہے۔ اضافی زمرے شامل کرنے کا اختیار صرف مرکزی حکومت کے پاس ہے۔

ایکٹ کا سیکشن 9 واضح طور پر کہتا ہے کہ آدھار نمبر اپنے آپ میں "شہریت یا سکونت کا ثبوت نہیں ہے"۔ اس لیے آدھار کو امیگریشن کی جانچ کے لیے استعمال (Domicile) کرنا خود اس ایکٹ کے بنیادی مقصد کے خلاف جاتا ہے۔

جنم دیا ہے۔ یہ بھی نامعلوم ہے کہ حذف کیے گئے افراد میں سے کتنے لوگوں نے اصل میں اپیلیں دائر کی ہیں اور کتنے لوگ لاعلمی، بے بسی یا نام خارج کیے جانے کی وجہ بتانے والے کسی سرکاری نوٹس کی عدم موجودگی کے باعث اپیل ہی نہیں کر سکے۔ بنگال میں سرگرم کئی سماجی تنظیموں نے بتایا کہ بڑی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اب تک ووٹر لسٹ میں دوبارہ شمولیت کی درخواست بھی نہیں دے سکے ہیں۔

مدراس ہائی کورٹ کے سابق جج، جسٹس کے چندرو جن کا انٹرویو انگریزی ویب سائٹ "دی لیفلیٹ" میں شائع ہوا ہے جس میں کہتے ہیں کہ "سپریم کورٹ نے اسوسی ایشن فار ڈیموکریٹک ریفارمز بنام الیکشن کمیشن آف انڈیا (2026) کے فیصلے میں واضح کیا تھا کہ کسی شخص کی شہریت محض اس وجہ سے ختم نہیں ہوگی کہ وہ ایس آئی آر مشق کے نتیجے میں انتخابی فہرستوں میں شامل ہونے کے لیے نااہل پایا گیا ہے۔ اس سے قبل لال بابو حسین بنام الیکٹورل رجسٹریشن آفیسر (1995) میں بھی سپریم کورٹ نے کہا تھا کہ اگر نام خارج کرنے سے پہلے متعلقہ شخص کو لازمی طور پر بتایا جانا چاہیے کہ اس کی ہندوستانی شہری کی حیثیت کے بارے میں شک کیوں پیدا ہوا ہے، تاکہ وہ یہ ثابت کر سکے کہ شک کی بنیاد غلط ہے۔ جسٹس چندرو کے مطابق چونکہ مغربی بنگال میں حذف کیے گئے افراد کو اخراج کی وجوہات ہی نہیں بتائی گئیں اس لیے قانون یا حقیقت کے آئینے میں یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تمام لوگ جنہیں فہرستوں سے ہٹایا گیا ہے یا جنہوں نے اپیلیں دائر نہیں کی ہیں وہ غیر ملکی شہری ہیں۔ بہت سے لوگوں کو تو اپنی شہریت ثابت کرنے کا کوئی مناسب موقع ہی نہیں ملا۔ انہوں نے مزید وضاحت کی کہ فہرستوں سے نام کا اخراج شہریت کی کمی کے علاوہ کئی دیگر تکنیکی وجوہات کی بنا پر بھی ہو سکتا ہے اور فلاحی اسکیموں سے ایسے کسی بھی انکار کو ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ترقیاتی اسکیمیں آئین کے حصہ IV (ریاست کے رہنما اصولوں) کے تحت ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہیں اور غذائی سبسڈی، ٹرانسپورٹ و ہاؤسنگ جیسی اسکیمیں دفعہ 21 (حقِ زندگی) کے دائرے میں آتی ہیں۔ نیشنل فوڈ سیکیورٹی ایکٹ، 2013، جو پی ڈی ایس (راشن سسٹم) فراہم کرتا ہے، ملک میں غذا کے حق کو یقینی بنانے والے جامع ترین قوانین میں سے ایک ہے۔ سپریم کورٹ نے متعدد مقدمات میں جینے کے بنیادی حق (دفعہ 21) کے ایک لازمی جزو کے طور پر باوقار غذا کے حق کو تسلیم کیا ہے جو صرف شہریوں تک محدود نہیں بلکہ ہر انسان کے لیے ہے۔ حال ہی میں انون دھون بنام یونین آف انڈیا (2024) میں جسٹس پنکج متھل اور جسٹس بیلا ایم ترویدی کے بنچ نے واضح طور پر کہا تھا کہ بھلے ہی بھارت کا آئین صریح الفاظ میں غذا کا حق فراہم نہیں کرتا لیکن آئین کی دفعہ 21 میں درج زندگی کا بنیادی حق انسانی وقار کے ساتھ جینے، غذا حاصل کرنے اور دیگر بنیادی ضروریات کو اپنے اندر شامل کرتا ہے۔ آئین کی دفعہ 47 بھی یہ فراہم کرتی ہے کہ ریاست اپنے لوگوں کی غذائیت کی سطح اور معیارِ زندگی کو بلند کرنے اور عوامی صحت کی بہتری کو اپنے اولین فرائض میں شمار کرے گی۔ جسٹس چندرو نے مختلف قانونی مثالوں سے واضح کیا کہ مروجہ قانونی فریم ورک میں بنگال حکومت کے اس سرکولر کی کوئی بنیاد نہیں ہے جو راشن کو ووٹر لسٹ سے مشروط کرتا ہے۔

جسٹس کے ایس پٹا سوامی (2018) میں اپنے اختلافی نوٹ میں سابق چیف جسٹس ڈی وائی چندر چوڑ نے موقف اختیار کیا تھا کہ ریاست کا کوئی بھی جائز مقصد بنیادی حق کی قیمت پر آئینی طور پر پورا نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے کہا تھا کہ بنیادی حقوق کی فراہمی میں "کسی غلطی کی گنجائش نہیں ہو سکتی" کیونکہ کسی خاندان کو خوراک سے محروم کرنا انتہائی غربت، غذائی قلت اور یہاں تک کہ موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔

انگریزی میگزین 'دی فرنٹ لائن' کو دیے گئے ایک حالیہ انٹرویو میں آر جے ڈی کے رکنِ پارلیمنٹ منوج کمار جھا نے گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "اگر آپ دستور ساز اسمبلی کے مباحثوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس وقت عالمگیر حقِ رائے دہی (Universal Franchise) پر بحث جاری تھی۔ ہمارے بانیانِ دستور نے ووٹ کے حق کو جس تقدس اور اہمیت کے ساتھ دیکھا تھا، آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ بنگال، بہار اور دیگر ریاستوں میں جیسے جیسے ایس آئی آر کا عمل آگے بڑھے گا، اس ملک میں ایسے لوگ پیدا ہو سکتے ہیں جو نہ صرف ووٹ کے حق سے محروم ہوں گے بلکہ عملاً بے وطن (Stateless) بھی بن جائیں گے"

انتخابی فہرستوں سے خارج کیے گئے افراد کو فلاحی اسکیموں کے فوائد سے بھی محروم کیے جانے کے بعد یہ خدشہ اب ایک ٹھوس ادارہ جاتی شکل اختیار کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ پی ڈی ایس سے مستفید ہونے والوں کے ناموں کی انتخابی فہرستوں سے تصدیق کی آخری تاریخ 15 جون مقرر کی گئی تھی۔ مغربی بنگال کے ان لاکھوں باشندوں کے لیے جن کے نام انتخابی فہرستوں سے خارج کر دیے گئے تھے، اس عمل نے ان کے راشن کے حق تک رسائی کے دروازے تقریباً بند کر دیے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اب تک کسی بھی مجاز قانونی اتھارٹی نے انہیں باضابطہ طور پر غیر ملکی شہری قرار نہیں دیا ہے۔

آسام حکومت کی 18 سال سے زائد عمر کے افراد کے لیے آدھار کارڈ کے اجرا پر پابندی

آسام کے وزیرِ اعلیٰ ہیمنت بسوا سرما کے حالیہ اعلان نے ایک نئی قانونی اور سیاسی بحث کو جنم دے دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ریاستی حکومت اب 18 سال یا اس سے زیادہ عمر کے افراد کے لیے آدھار کارڈ جاری کرنے کے موجودہ طریقۂ کار کو ختم کر دے گی۔ حکومت کا مؤقف ہے کہ اس اقدام کا مقصد بنگلہ دیش سے آنے والے غیر قانونی تارکینِ وطن کو بھارتی شناختی دستاویزات حاصل کرنے سے روکنا اور ان کی مؤثر جانچ پڑتال کو یقینی بنانا ہے۔

تاہم، قانونی ماہرین اس بات پر منقسم ہیں کہ آیا کوئی ریاستی حکومت، جس کا کردار آدھار ایکٹ 2016 کے تحت محض ایک رجسٹرار (Registrar) یا اندراجی سہولت فراہم کرنے والے ادارے کا ہے، آدھار کے اندراج پر اس نوعیت کی اضافی شرط یا پابندی عائد کر سکتی ہے، جبکہ آدھار ایکٹ 2016 اور یونیک آئیڈینٹٹی فکیشن اتھارٹی آف انڈیا (UIDAI) کے ضوابط میں ایسی کسی شرط کا ذکر موجود نہیں ہے۔ وزیرِ اعلیٰ ہیمنت بسوا سرما کے مطابق اب آسام میں ضلعی سطح پر بالغ افراد کے آدھار کارڈ براہِ راست منظور نہیں کیے جائیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ "اگر کوئی واقعی مستحق اور حقیقی شہری ہوگا تو ڈپٹی کمشنر (DC) اس کی درخواست حکومت کو بھیجیں گے اور حکومتی منظوری کے بعد ہی آدھار کارڈ جاری کیا جائے گا۔ تاہم، ضلعی سطح پر اب 18 سال سے زائد عمر کے کسی بھی شخص کو معمول کے طریقۂ کار کے تحت آدھار کارڈ جاری نہیں کیا جائے گا۔ ریاستی حکام کا کہنا ہے کہ اگست 2025 میں کابینہ کے ایک فیصلے کے بعد بالغ افراد کے آدھار اندراج کے لیے ضلعی سطح پر تصدیق کا عمل پہلے ہی سخت کر دیا گیا تھا اور موجودہ اعلان اسی پالیسی کا تسلسل ہے۔

تاہم بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا ریاستی حکومت کے پاس ایسا کرنے کا قانونی اختیار موجود ہے؟ زیادہ تر آئینی اور قانونی ماہرین کا کہنا ہے کہ ریاستی حکومت کے پاس آدھار کے اندراج کو روکنے کا کوئی قانونی اختیار نہیں ہے۔ ان کے مطابق زیادہ سے زیادہ کوئی ریاستی حکومت مرکزی حکومت سے درخواست کر سکتی ہے کہ وہ UIDAI کو اس حوالے سے مناسب ہدایات جاری کرے" آدھار کارڈ کے اجرا میں ریاستی حکومت کا براہِ راست کوئی کردار نہیں ہوتا۔ شہری براہِ راست UIDAI کے پاس درخواست دیتا ہے، اس کی بائیومیٹرک معلومات کی جانچ مرکزی سطح پر ہوتی ہے اور آدھار نمبر بھی UIDAI ہی جاری کرتی ہے۔ یہ معاملہ اس سے قبل بھی عدالتوں میں زیرِ بحث آ چکا ہے۔ 2022 میں سپریم کورٹ نے این آر سی (NRC) کی بنیاد پر آسام میں بعض افراد کو آدھار جاری نہ کرنے کے خلاف دائر ایک عرضی پر مرکز، UIDAI اور آسام حکومت کو نوٹس جاری کیا تھا۔ یہ مقدمہ اب بھی زیرِ التوا ہے۔ حال ہی میں چیف جسٹس سوریا کانت اور جسٹس جوئے مالیا باگچی پر مشتمل بنچ نے ایک عوامی مفاد کی عرضی (PIL) پر سماعت سے انکار کر دیا جس میں غیر قانونی تارکینِ وطن کے خدشے کے پیشِ نظر چھ سال سے زیادہ عمر کے نئے درخواست گزاروں کے آدھار اندراج پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ عدالت نے قرار دیا کہ یہ انتظامی اور پالیسی نوعیت کا معاملہ ہے، جس میں مداخلت مناسب نہیں۔ یونیک آئیڈینٹی فکیشن اتھارٹی آف انڈیا کے 31 مئی 2026 تک کے اعداد و شمار کے مطابق، آسام میں آدھار اندراج کی شرح 91.46 فیصد ہے۔ ریاست کی متوقع آبادی 3.67 کروڑ ہے جن میں سے تقریباً 3.3 کروڑ افراد کے پاس آدھار کارڈ موجود ہے۔ یہ شرح قومی اوسط 94.43 فیصد سے کم ہے۔

Matrimonials ضرورتِ رشتہ

قبول ہے

مشرقی اتر پردیش سے تعلق رکھنے والے ایک دینی مزاج انجینئر لڑکے کے لئے ایک ایسی لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے جو پابند شریعت ہو اور پردے کا بالخصوص اہتمام کرتی ہو۔ لڑکے کی عمر 33 سال، قد 5 فٹ 4 انچ، تعلیم B Tech Electrical & Electronics لڑکا اس وقت سعودی عرب کی الفنار کمپنی میں ریاض میں بحیثیت Planning Engineer کام کر رہا ہے۔ شادی کے بعد لڑکی کو سعودی عرب ہی میں ساتھ رہنا ہے۔

نوٹ: لڑکے کی پہلی بیوی سے طلاق ہو چکی ہے۔

موبائل نمبر 9919382163

ایک معزز سنی مسلم گھرانے کی لڑکی، عمر 26 سال، قد 5 فیٹ 5 انچ رنگ گورا، دین دار، ایم ڈی جنرل میڈیسن سال دوم میں زیر تعلیم، جی آئی او یونٹ کی فعال ممبر لڑکی کے لیے رشتہ مطلوب ہے۔ حیدر آباد اور اطراف سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر/ ایم ڈی/ ایم ایس یا مساوی تعلیم یافتہ، معاشی طور پر مستحکم پڑھے لکھے اور خاندانی اقدار کے حامل ایسے گھرانے سے رشتہ کو ترجیح دی جائے گی جو شرک و بدعات سے پاک ہو۔ بیرونِ ملک مقیم افراد اور ایجنٹ حضرات براہ کرم زحمت نہ کریں۔

موبائل نمبر 9494710447

Suitable Alliance are invited for sunni salmani Boy 32, 5/8
M.A , D. Pharma working as pharmacist in reputed hospital
Girl 30 , 5/6" M.sc (microbiologist) in MNC
Father retired govt. Officer
Mobile. 9286501663
9084058569

بہار سے تعلق رکھنے والی دینی مزاج کی لڑکی جو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے بیٹک ہے ابھی بنگلور میں سوفٹویئر انجینئر کی حیثیت سے برسرِ روزگار ہے کے لیے دینی مزاج کے لڑکے سے رشتہ مطلوب ہے بہار کے رشتہ کو ترجیح دی جائے گی

رابطہ نمبر: 9162066986

WANTED BRIDE
Hyderabad based Sunni Muslim educated family invites alliance for son 28 yrs, 5'11", MS (CSE) from New York on OPT sufficiently well-placed in New Haven (Ct), never married, family-oriented, simple, practicing Muslim, .well-mannered, non-smoker
Practicing Muslim US citizen girl from a cultured family free from shirk/biddah is sought. Hafiza is preferred
Contact : 9441735657

حدیث شریف:

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہم نے دو محبت کرنے والوں کے لیے نکاح جیسی بہترین اور کوئی چیز نہیں دیکھی۔ (ابن ماجہ)

خوب سے خوب تر کی جستجو یہاں پوری ہوتی ہے

ہفت روزہ دعوت میں اشتہار کامیابی کی ضمانت ہے اچھے، معیاری اور دین دار گھرانوں میں رشتوں کے لیے ضرورت رشتہ کالم میں اشتہار دیں اور اپنی پسند کے رشتے پائیں اشتہار کی بکنگ کے لیے ربط پیدا کریں

SPECIAL OFFER ON
Matrimonials
Advertisement
Get Upto
50% Discount
Book your Ad Today
8920589292 / 9091160829

مسجد نے دل جیتا!
اسلامی معاشرہ میں مسجد کا کردار

مسجد صرف نماز ادا کرنے کی عمارت نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے روحانی و فکری رہنمائی، رشد و ہدایت اور خیر و بھلائی کا مرکز ہے۔ مسجد صالح معاشرہ کی تعمیر کرتی ہے، نظم وضبط اور اجتماعی شعور کو فروغ دیتی ہے، انسان دوستی اور مساوات کا پیغام دیتی ہے، طہارت و پاکیزگی کا درس دیتی ہے، دلوں کی کدورتیں دور کر کے محبت و اخوت کو پروان چڑھاتی ہے اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا کام انجام دیتی ہے۔ مسجد اچھے اخلاق اور خدمتِ خلق کی علم بردار ہے۔

ایک طرف مسجد میں خدائے واحد لاشریک لہٗ کے سامنے سجدہ ریزی ہوتی ہے تو دوسری طرف اسی عبادت کے ذریعے بندگانِ خدا پر شفقت، خیر خواہی اور خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

وطنِ عزیز ہندوستان میں بھی متعدد مواقع پر مساجد نے اسی حقیقی کردار کا عملی ثبوت پیش کیا ہے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ حال ہی میں صنعتی شہر بھیونڈی میں نیٹ ری ایگزام کے موقع پر مسجد دار العلوم دینیات میں غیر مسلم طلباء کے والدین کے لیے مسجد کے بالائی حصے میں آرام، چائے پانی اور ناشتے کا انتظام کیا گیا۔ اس عملی نمونے کے ذریعے یہ باور کرایا گیا کہ مسجدیں دہشت گردی کے اڈے نہیں ہوتیں، بلکہ یہاں انسانیت پروان چڑھتی ہے۔

اسی طرح صمد نگر میں واقع مسجد و مدرسہ ہدیٰ میں خواتین کے لیے مدرسہ کے اندر اور مردوں کے لیے مسجد کے صحن میں قیام کا انتظام کر کے اس حقیقت کو نمایاں کیا گیا کہ مسجدیں امن، حسنِ سلوک اور سماجی خدمت کے مراکز ہوتی ہیں۔

تاریخ میں ایسے متعدد واقعات ملتے ہیں کہ بعض غیر مسلم افراد نے مسجد کی شان و عظمت، اس میں ہونے والی عبادت، مساوات اور روحانی فضا سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ اسی طرح تاریخ اس بات کی بھی گواہ ہے کہ مساجد میں قائم درسگاہوں سے غیر مسلموں نے بھی علمی استفادہ کیا۔

جامع الزیتونیہ، جو شہرِ فاس (مغرب) کی قدیم علمی و دینی روایت سے وابستہ ایک عظیم درسگاہ کے طور پر معروف رہی، اس کی بنیاد ۲۷۵ ہجری میں رکھی گئی۔ ایک طویل عرصہ تک یہ افریقہ کے مسلمانوں کی علمی درسگاہ رہی جہاں دینی و عصری علوم پڑھائے جاتے تھے اور بڑے بڑے اہلِ علم نے یہاں سے استفادہ کیا۔ بعض غیر مسلم اہلِ علم کے بارے میں بھی نقل کیا جاتا ہے کہ انہوں نے وہاں کے علمی ماحول سے فائدہ اٹھایا۔ (برہان، جلد ۶، ۱۹۵۹)

غرض مسجد محض ایک عمارت کا نام نہیں بلکہ وہ انسان سازی، کردار سازی اور صالح معاشرہ کی تعمیر کا مرکز ہے۔

نظام الدین فخرالدین، پونے

حجاب یا امتحان؟
کلثوم بانو نے استقامت کی مثال قائم کی

آج کے دور میں جب تعلیم، ترقی اور دنیاوی کامیابی کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنا دیا گیا ہے، ایسے ماحول میں اپنے دینی تشخص پر ثابت قدم رہنا ایک بڑا امتحان بن چکا ہے۔ راجستھان کی مسلم طالبہ کلثوم بانو نے نیٹ امتحان کے موقع پر اپنے حجاب اور دینی شناخت کو ترجیح دے کر یہ پیغام دیا کہ ایک مؤمن کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی رضا ہر دنیاوی مفاد سے بلند ہے۔ اس کی استقامت نے یہ ثابت کیا کہ تعلیم اور ترقی اہم ضرور ہیں، مگر اپنے اصولوں اور ایمان کی قیمت پر نہیں۔ اس کا کردار آج کی نوجوان نسل، خصوصاً مسلم طالبات کے لیے حوصلہ، خود اعتمادی اور دین پر ثابت قدمی کی ایک روشن مثال بن چکا ہے۔

محمد فداء المصطفیٰ قادری، کیرالا

حفظ القرآن
اکیڈمی
LEARN QURAN & ARABIC ONLINE WITH EXPERT TUTORS

نورانی قاعدہ | ناظرہ قرآن | حفظ القرآن | عربی گرامر | دعائیں

ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا

کیا
آپ کو قرآن کی تلاوت میں دشواری ہو رہی ہیں
قرآن کا صحیح تلفظ ادا کرنا آپ کے لئے مشکل ہیں
آپ قرآن صحیح کرنے کا پختہ ارادہ رکھتے ہیں
تو آپ صحیح جگہ صحیح وقت پر ہیں

تجوید القرآن، ہمہ قسم سیکھنے والوں کے لئے آن لائین ہم نے خصوصی کورسیس تیار کئے ہیں ان کورسیس کے پس منظر میں لڑکے اور لڑکیوں کے لئے ایک عمدہ، انتہائی تعلیم یافتہ، تجربہ کار، دانشمند ٹیم موجود ہے۔ یہ کورسیس سیکھنے والوں کو قرآن روانی کے ساتھ، بہترین مخارج اور چلینجنگ تجوید کے قواعدوں کے ساتھ پڑھنے تیار کرینگے

داخلے جاری ہیں

Working Time 6:00 am To 11:59 pm
Hifzul Quran Academy UK
: http://www.hifzulquranacademy.com/

برائے مہربانی اوپر آن لائین کورسیس سیکھنے کے مواقع کو اپنے رابطہ میں آگے بھیجیں یہاں اور آخرت میں اجر حاصل کریں۔
الحمدللہ ہم تمام ممالک میں آن لائین تعلیم دے رہے ہیں USA, UK, KSA, UAE, کینیڈہ، آسٹریلیا، بحرین، کویت، عمان، قطر، بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا وغیرہ۔۔۔ شکریہ

:+447511293938 | +91 77029 61898
Hifzul Quran Academy UK
: www.hifzulquranacademy.com
GET IT ON Google Play

दावत ہفت روزہ دعوت نئی دہلی
DAWAT, NEW DELHI

اداریہ

درسی کتابوں میں زہر کی آمیزش: نصاب کے پردے میں نظریاتی دراندازی

کسی بھی قوم کا مستقبل اس کی درسی کتابوں میں لکھا جاتا ہے۔ جو بیج آج چودہ پندرہ برس کے بچے کے ذہن میں ڈالا جائے، وہی کل تناور درخت بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہذب اقوام اپنے نصاب کو نظریاتی شرارتوں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ مگر ہمارے یہاں نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCERT) جس رفتار سے درسی کتابوں کو ایک خاص نظریے کا آلۂ کار بنا رہی ہے، وہ اب ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ تاریخ کے ساتھ مسلسل کھلواڑ کے بعد اب ایک نئی اور زیادہ خطرناک شرارت سامنے آئی ہے: نویں جماعت کی سوشل سائنس کی نئی کتاب میں عورت کے سماجی مقام پر گفتگو کرتے ہوئے منوسمرتی کا حوالہ بطورِ سند پیش کیا گیا ہے۔

"State and Society up to 1000 CE" کے باب میں ویدک دور کو ایسا زمانہ بتایا گیا ہے جب عورت کو باوقار مقام حاصل تھا اور اس دعوے کے لیے منوسمرتی کا وہ شلوک نقل کیا گیا ہے جس کا مفہوم ہے کہ "جہاں عورتوں کی عزت ہوتی ہے، وہاں دیوتا خوش ہوتے ہیں" کتاب میں یہ بھی درج ہے کہ بعد کے ادوار میں عورت کا مقام "گھٹتا اور بدلتا" رہا۔ بظاہر یہ جملہ معتدل نظر آتا ہے مگر اصل زہر منوسمرتی کو "بطورِ سند" پیش کرتے ہوئے پروسا گیا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ منوسمرتی کا نام کیوں لیا گیا؛ سوال یہ ہے کہ عورت کی عزت ثابت کرنے کے لیے بچوں کے سامنے بطورِ ثبوت اسی کتاب کو کیوں پیش کیا گیا جو عورتوں اور دلتوں کی محکومی کی سب سے بدنام دستاویز سمجھی جاتی ہے؟

یہی اس شرارت کا مرکزی نکتہ ہے۔ منوسمرتی قدیم ادب کا کوئی غیر جانب دار نمونہ نہیں۔ یہ وہ کتاب ہے جسے دستورِ ہند کے معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے 25 دسمبر 1927ء کو مہاڈ ستیہ گرہ کے موقع پر ہزاروں افراد کے سامنے علانیہ نذرِ آتش کیا تھا؛ وہ دن آج بھی "منوسمرتی دہن دِوس" کہلاتا ہے۔ امبیڈکر کے نزدیک یہ کتاب برہمنی نظام، ذات پات کی درجہ بندی اور صنفی نابرابری کا بنیادی ضابطہ اور صدیوں سے مسلط ظلم کی علامت تھی۔ جس کتاب کو آزاد ہندوستان کے سب سے بڑے دستوری مفکر نے ناانصافی کی علامت قرار دے کر جلایا تھا، اسی کو سرکاری نصاب میں احترامِ نسواں کی دلیل بنانا تاریخ کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

اور یہ صرف علامتی تضاد نہیں؛ خود منوسمرتی کے مندرجات اس کی تعریف کا منہ چڑاتے ہیں۔ اسی کتاب کا معروف حکم ہے کہ عورت کبھی آزادی کی مستحق نہیں ہے۔ عورت کو چاہیے کہ بچپن میں باپ، جوانی میں شوہر اور بڑھاپے میں بیٹے کی نگرانی میں رہے۔ یہی کتاب عورت کو وراثت، تعلیم اور خود مختاری سے محروم رکھتی ہے اور ستی و بال وِواہ جیسی رسموں کو فکری بنیاد فراہم کرتی ہے؛ ذات پات کے باب میں تو اس کی سفاکی اور بھی عیاں ہے۔ ایسی کتاب میں سے بظاہر ایک خوش نما جملہ نکال کر، پوری کتاب میں پھیلے سیکڑوں ظالمانہ احکام کو دانستہ چھپا کر بچوں کے سامنے رکھنا ہی وہ cherry-picking ہے جس پر ملک کے مؤرخین نے سخت تشویش ظاہر کی ہے۔ یہ تعلیم نہیں ہے بلکہ ایک ایسے نظامِ تفریق کے حق میں ذہن سازی ہے جسے جدید ہندوستان آئینی طور پر مسترد کر چکا ہے۔

نصاب میں کچھ سچائیوں کو چھپا کر بھی جھوٹ بولا جاتا ہے۔ کتاب میں غالباً اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ امبیڈکر نے اس کتاب کو کیوں جلایا تھا یا پھولے اور پیریار جیسے مصلحین نے اسے انسانی مساوات کے خلاف اعلانِ جنگ کیوں سمجھا۔ جب کسی متنازع متن کی صرف خوبی دکھائی جائے اور صدیوں کی علمی تنقید حذف کر دی جائے تو وہ تعلیم نہیں بلکہ پروپیگنڈا بن جاتی ہے۔ چودہ سال کا طالبِ علم اس نزاکت کو سمجھنے کی عمر میں نہیں ہوتا؛ وہ وہی سچ مان لے گا جو نصاب اسے تھمائے گا۔

یہ کوئی اتفاق نہیں بلکہ ایک منظم سلسلے کی تازہ کڑی ہے۔ پچھلے برسوں میں مغل حکم رانوں کے ابواب یکطرفہ طور پر بدلے گئے، انگریزی میڈیم کی کتابوں کو ہندی نام دیے گئے، ان سب کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو سمت واضح ہو جاتی ہے: تاریخ کو شواہد اور توازن کے بجائے ایک مخصوص نظریاتی سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے جسے ناقدین "نصاب کی بھگوا کاری" کہتے ہیں۔

اس کا داؤ ایک شلوک تک محدود نہیں؛ یہ دو ہندوستانوں کے درمیان نظریاتی کشمکش ہے۔ ایک وہ ہندوستان جو اپنی دستوری بنیادوں، مساوات، آزادی اور بھائی چارے پر کھڑا ہے اور جس کے معمار نے منو کے قانون کو قطعی طور پر رد کیا ہے؛ اور دوسرا وہ تصور جو مساوات پر مبنی دستور کے نفاذ کے فوراً بعد یہ شکوہ کرتا ہے کہ کاش یہ آئین منو کے قوانین سے ماخوذ ہوتا۔ نصاب میں منوسمرتی کا دبے پاؤں داخلہ اسی پرانی خواہش کی نئی لیکن مکروہ شکل ہے۔

یہ دلیل کہ "قدیم ادب کو جاننا چاہیے، خواہ اس کے بعض حصے متنازع ہوں" بظاہر معقول نظر آتی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے انتہائی مغالطہ آمیز ہے۔ قدیم کتابوں کا مطالعہ ضرور ہونا چاہیے، مگر تنقیدی شعور کے ساتھ، اعلیٰ تعلیم کی سطح پر اور تمام تضادات کو سمیٹتے ہوئے۔ جس کتاب میں عورت کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالا گیا ہو اور دلت کو ذلیل کیا گیا ہو، اسے نویں جماعت کے بچے کے سامنے بطورِ عزت کی سند پیش کرنا مطالعہ نہیں، ذہن سازی ہے۔

جس ملک میں آج بھی ذات اور صنف کی بنیاد پر امتیاز زندہ ہے، وہاں اگلی نسل کے ذہن میں ایک ظالمانہ کتاب کا احترام بٹھا دینا ان سماجی اصلاحات کی جڑ کاٹنا ہے جن کے لیے امبیڈکر، پھولے اور بے شمار مصلحین نے زندگیاں کھپا دیں۔ جب نصاب ہی اونچ نیچ کو روایت کا حسین نام دے گا تو تعصب کو ثقافت کا تحفظ مل جائے گا۔

ملک کے اہلِ علم، مؤرخین، اساتذہ، صحافیوں اور باشعور شہریوں کی ذمہ داری ہے کہ اس کا سخت نوٹس لیں۔ نصاب کوئی نجی معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ قومی حافظے کی تشکیل ہے اور اس پر خاموشی اختیار کرنا جرم ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مؤرخین ان تبدیلیوں کا مدلل محاکمہ کریں، والدین اور اساتذہ بچوں میں تنقیدی مطالعے کا شعور بیدار کریں، اور سِول سوسائٹی اس مطالبے پر قائم رہے کہ نصاب سیاست سے پاک، شواہد پر مبنی اور دستوری اقدار سے ہم آہنگ رکھا جائے۔ تعلیم کو نفرت اور تفریق کا اوزار بننے سے روکنا پورے جمہوری معاشرے کا فریضہ ہے۔ منوسمرتی کو امبیڈکر نے ایک بار جلایا تھا۔ افسوس کہ آج اسی راکھ سے ایک نئی چنگاری برآمد کر کے ہمارے بچوں کے ہاتھ میں تھمائی جا رہی ہے۔ اس زہر کو پہچاننا اور آنے والی نسل کو اس سے بچانا اِس وقت ہماری سب سے بڑی قومی و اخلاقی ذمہ داری ہے۔

واٹس ایپ کی پوشیدہ سیاست اور ہندوستانی جمہوریت

کیا ہندوستان کی سیاست اب بیالٹ باکس سے زیادہ موبائل فون میں طے ہو رہی ہے؟

زعیم الدین احمد حیدر آباد

سیاست کبھی جلسوں، جلوسوں، وال پینٹنگس، اخبارات اور پارلیمنٹ کی بحثوں سے عبارت تھی۔ پھر ٹیلی ویژن آیا اور سیاسی بیانیے کی تشکیل کا سب سے طاقتور ذریعہ بن گیا۔ لیکن اکیسویں صدی کے اس تیسری دہائی میں ایک ایسا پلیٹ فارم ابھرا جس نے نہ صرف سیاست کا رخ بدلا بلکہ سماج اور جمہوریت کی ہیئت ہی بدل دی۔ یہ پلیٹ فارم ہے واٹس ایپ۔

ہندوستان میں اس وقت پچاس کروڑ سے زائد افراد واٹس ایپ کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ دنیا میں واٹس ایپ استعمال کرنے والوں کی سب سے بڑی آبادی ہے۔ بظاہر یہ ایک معمولی پیغام رسانی یعنی میسیجنگ اپلی کیشن ہے لیکن حقیقت میں یہ آج ہندوستان کی سیاسی جنگوں، نظریاتی کشمکشوں اور انتخابی مہمات کا سب سے اہم میدان بن چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر واٹس ایپ میں ایسی کیا طاقت ہے کہ سیاسی جماعتیں اربوں روپے خرچ کر کے اس پر اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہتی ہیں اور اپنی موجودگی کو مضبوط کر رہی ہیں؟ اور کیا یہ پلیٹ فارم جمہوریت کو مضبوط بنا رہا ہے یا کمزور؟

واٹس ایپ: ایک خاموش سیاسی ہتھیار

سوشل میڈیا کے دیگر پلیٹ فارمز مثلاً فیس بک، ایکس (سابقہ ٹویٹر) اور یوٹیوب پر ہونے والی سرگرمیاں نسبتاً عوامی ہوتی ہیں۔ ان پر پوسٹ ہونے والا مواد سب کے سامنے آتا ہے اور اس پر تنقید و مباحثہ بھی ممکن ہوتا ہے۔ مگر واٹس ایپ کا نظام مختلف ہے۔ واٹس ایپ گروپس اور براڈکاسٹ چینلز ایک بند کمرے کی طرح کام کرتے ہیں۔ یہاں معلومات کا بہاؤ تو بڑی تیزی سے ہوتا ہے لیکن اس کی نگرانی تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔

اگر واٹس ایپ معلومات کے بجائے پروپیگنڈا، مکالمے کے بجائے نفرت اور شعور کے بجائے جذبات کو فروغ دینے لگے تو یہ جمہوریت کے لیے ایک سنگین خطرہ بن سکتا ہے۔ آج ہندوستانی جمہوریت کے سامنے سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ کیا عوام اپنے موبائل فون کو معلومات کا ذریعہ بنائیں گے یا اسے سیاسی انجینئرنگ کا آلہ بننے دیں گے؟ کیونکہ آنے والے برسوں میں ہندوستان کی سیاست شاید پارلیمنٹ سے زیادہ اسکرینوں پر لکھی جائے گی اور جمہوریت کی جنگ بیالٹ باکس سے پہلے واٹس ایپ گروپس میں لڑی جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ سیاسی جماعتوں نے اسے اپنی انتخابی حکمت عملی کا مرکزی ستون بنا لیا ہے۔ سیاسی مبصرین کے مطابق 2014 کے بعد ہندوستانی سیاست میں واٹس ایپ کا استعمال ایک نئے مرحلے میں داخل ہوا۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں گروپس کے ذریعے مخصوص بیانیے، ویڈیوز، تصاویر اور سیاسی پیغامات عوام تک پہنچائے جاتے ہیں۔

واٹس ایپ کی سب سے بڑی طاقت یہ ہے کہ یہ معلومات کو ذاتی تعلقات کے ذریعے منتقل کرتا ہے، یعنی اینڈ ٹو اینڈ انکرپٹیڈ ہوتا ہے۔ اگر کوئی خبر کسی نامعلوم ویب سائٹ سے آتی ہے تو لوگوں کو اس پر شک کرنے کی گنجائش ہوتی ہے لیکن اگر وہی خبر خاندان کے کسی فرد، دوست یا محلے کے کسی معزز شخص کے ذریعے آئے تو اس پر یقین کرنے کے امکانات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ یہی وہ نفسیاتی پہلو ہے جو واٹس ایپ کو سیاسی طور پر طاقتور بناتا ہے۔ سیاسی پارٹیاں جانتی ہیں کہ لوگ میڈیا سے زیادہ اپنے جاننے والوں پر اعتماد کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک منظم طریقے سے سیاسی مواد کو عام شہریوں کے ذریعے آگے بڑھایا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ مواد "عوامی رائے" محسوس ہونے لگتا ہے حالانکہ اس مواد کی تیاری کسی سیاسی وار روم میں ہوئی ہوتی ہے۔

فیک نیوز کی فیکٹری

واٹس ایپ پر گردش کرنے والی معلومات کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان کی تصدیق مشکل ہوتی ہے۔ گزشتہ ایک دہائی میں ہندوستان میں متعدد واقعات ایسے پیش آئے جن میں جھوٹی خبروں یعنی فیک نیوز نے خطرناک نتائج پیدا کیے۔ کبھی بچوں کے اغوا کی افواہوں نے ہجومی تشدد یعنی موب لینچنگ کو جنم دیا، کبھی گائے کی اسمگلنگ کی جھوٹی افواہوں سے فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا ملی اور کبھی انتخابی ماحول میں گمراہ کن اطلاعات پھیلائی گئیں۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ واٹس ایپ پر پھیلنے والی جھوٹی خبریں عام خبروں کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے سفر کرتی ہیں کیونکہ وہ جذبات کو اپیل کرتی ہیں، خصوصاً خوف، غصے اور مذہبی حساسیت کو ابھارتی ہیں۔

ہندوستان جیسے کثیر مذہبی اور کثیر الثقافتی ملک میں واٹس ایپ کے ذریعے فرقہ وارانہ بیانیے کی ترویج ایک بڑا مسئلہ بن چکی ہے۔ متعدد مطالعات سے معلوم ہوا ہے کہ مختلف کمیونٹیوں کے خلاف نفرت انگیز مواد، تاریخی واقعات کی مسخ شدہ تشریحات اور مذہبی منافرت پر مبنی پیغامات بڑی تعداد میں گردش کرتے ہیں۔ اکثر یہ پیغامات کسی مستند سورس کے بغیر ہوتے ہیں مگر بار بار دہرائے جانے کی وجہ سے بہت سے لوگ انہیں حقیقت سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ عمل صرف سماجی ہم آہنگی ہی نہیں بلکہ جمہوری فضا کو بھی متاثر کرتا ہے کیونکہ جمہوریت کی بنیاد باخبر اور معروضی رائے عامہ پر ہوتی ہے، نہ کہ جذباتی اشتعال پر!

ڈیجیٹل پروپیگنڈے کا نیا دور

سیاسیات کے ماہرین اب "ڈیجیٹل پروپیگنڈا" کی اصطلاح استعمال کرنے لگے ہیں۔ ماضی میں پروپیگنڈا سرکاری ریڈیو، سرکاری اخبارات یا پوسٹروں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ آج وہی کام واٹس ایپ گروپس کے ذریعے ہو رہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب پروپیگنڈا زیادہ ذاتی، زیادہ تیز اور زیادہ مؤثر ہو گیا ہے۔ کئی سیاسی پارٹیوں کے پاس آئی ٹی سیلز، ڈیجیٹل کنٹینٹ کریکٹرز اور سوشل میڈیا مینیجرز کی پوری فوج موجود ہے جو روزانہ ہزاروں پیغامات تیار کر کے مخصوص حلقوں تک پہنچاتی ہے۔

یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ واٹس ایپ صرف نقصان ہی نقصان ہے۔ اس پلیٹ فارم نے معلومات تک رسائی کو بھی آسان بنایا ہے۔ دور دراز علاقوں کے لوگ اب قومی مباحث میں حصہ لے سکتے ہیں۔ عوامی تحریکیں منظم کی جا سکتی ہیں اور حکومتوں سے جواب دہی کا مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ شہریت ترمیمی قانون یعنی سی اے اے کے خلاف احتجاجوں سے لے کر کسان تحریک تک، واٹس ایپ نے عوامی رابطے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب صحیح معلومات کی جگہ غلط معلومات لے لیتے ہیں اور مکالمے کی جگہ نفرت لے لیتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ واٹس ایپ کے پاس فیس بک یا یوٹیوب کی طرح عوامی الگورتھم نہیں ہوتے مگر اس کے اثرات کئی بار ان سے کہیں زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔

اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ واٹس ایپ نجی گفتگو کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ انسان کے گھر، خاندان اور ذاتی تعلقات کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سیاست ذاتی تعلقات کے ذریعے منتقل ہوتی ہے تو اس کا اثر بھی زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

ہندوستانی جمہوریت اس وقت صرف انتخابی چیلنجوں کا سامنا نہیں کر رہی ہے بلکہ معلوماتی چیلنجوں سے بھی دوچار ہے۔ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ کون سی پارٹی واٹس ایپ استعمال کر رہی ہے بلکہ یہ ہے کہ کیا شہری اس کنٹینٹ کو تنقیدی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں؟ کیا وہ ہر فارورڈ کو سچ مان لیتے ہیں؟ کیا وہ خبر کے سورس کی جانچ کرتے ہیں؟ کیا وہ اختلافی رائے کو برداشت کرتے ہیں؟ یہ سوالات مستقبل کی جمہوریت کے لیے بنیادی حیثیت کے حامل ہیں۔

ایسی صورت حال میں چند اقدامات ناگزیر ہو جاتے ہیں، وہ یہ کہ ڈیجیٹل لٹریسی کو فروغ دیا جائے۔ اسکولوں اور کالجوں میں میڈیا لٹریسی کو بطور نصاب بنایا جائے۔ سیاسی پارٹیوں کے ڈیجیٹل اخراجات میں شفافیت لائی جائے۔ فیک نیوز کے خلاف آزاد فیکٹ چیکنگ اداروں کو مضبوط بنایا جائے۔ شہریوں میں تنقیدی سوچ کو فروغ دیا جائے۔

واٹس ایپ اب محض ایک موبائل ایپ نہیں رہا۔ یہ اب ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور نظریاتی مستقبل کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ ایک ایسا میدان ہے جہاں انتخابات سے پہلے رائے عامہ تشکیل پاتی ہے، سیاسی بیانیے جنم لیتے ہیں اور بعض اوقات سچ اور جھوٹ کے درمیان حدیں دھندلا جاتی ہیں۔ جمہوریت صرف ووٹ ڈالنے کا نام نہیں ہے بلکہ درست معلومات کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کا عمل بھی جمہوریت ہے۔ اگر واٹس ایپ معلومات کے بجائے پروپیگنڈا، مکالمے کے بجائے نفرت اور شعور کے بجائے جذبات کو فروغ دینے لگے تو یہ جمہوریت کے لیے ایک سنگین خطرہ بن سکتا ہے۔ آج ہندوستانی جمہوریت کے سامنے سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ کیا عوام اپنے موبائل فون کو معلومات کا ذریعہ بنائیں گے یا اسے سیاسی انجینئرنگ کا آلہ بننے دیں گے؟ کیونکہ آنے والے برسوں میں ہندوستان کی سیاست شاید پارلیمنٹ سے زیادہ اسکرینوں پر لکھی جائے گی اور جمہوریت کی جنگ بیالٹ باکس سے پہلے واٹس ایپ گروپس میں لڑی جائے گی۔

رام مندر چڑھاوے کی چوری کا معاملہ، اروند کیجریوال نے کیا چوروں کو پھانسی دینے کا مطالبہ

چمپت رائے اور انیل مشرا عہدوں سے مستعفی، ایس آئی ٹی جانچ رپورٹ کے بعد آٹھ ملزم جیل رسید

ایم پی کے وزیر اعلیٰ موہن سنگھ یادو کے خاندان پر زمین گھپلے کا الزام، کانگریس نے استعفے کا مطالبہ کیا، اکھلیش یادو نے کیا موہن یادو کا دفاع

راجستھان کے سرحدی اضلاع میں مسجدوں کے خلاف آپریشن کلین، باڑمیر کے ہندوؤں نے احتجاجی مظاہرے میں مسلمانوں کا ساتھ دیا

پنجاب میں ماب لنچنگ کے مجرموں کو سزا دینے والی جج کے خلاف احتجاج، ہندوتوادیوں نے مسلم جج کی مذہبی شناخت کو نشانہ بنایا

بریلی پولیس نے محرم کے جلوس میں پاکستان کے نعرے لگوانے کا کیا پردہ فاش، ہندو نوجوان نے ہی مسلم بچوں سے سازش کر کے لگوائے تھے نعرے

شمال کا حال

محمد ارشد ادیب

شمالی ہند میں ان دنوں رام مندر میں چڑھاوے کی چوری پر بحث گرم ہے۔ ہر روز نت نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ رام مندر ٹرسٹ کا پورا سسٹم سوالوں کے گھیرے میں ہے۔ مندر تحریک و تعمیر سے وابستہ تنظیمیں آپس میں ہی دست بہ گریباں ہیں۔ ایس آئی ٹی جانچ کے بعد ایف آئی آر بھی درج ہو گئی ہے اور آٹھ ملزموں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا ہے۔ انکے ٹھکانوں پر تلاشی مہم بھی چل رہی ہی۔ تاہم اصل کہانی ابھی تک پوری طریقے سے باہر نہیں آئی ہے۔ مفادات کے ٹکراؤ میں کچھ لوگ حساب برابر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ مندر ٹرسٹ کے جنرل سکریٹری چمپت رائے اور ٹرسٹی انیل مشرا کے استعفوں کی تصدیق ہو گئی ہے۔

ایودھیا میں چوری یا ڈاکہ؟

رام مندر تعمیر کے سب سے اہم ذمہ دار اور وزیر اعظم کے دفتر کے قریبی سابق نوکر شاہ نریندر مشرا نے چندہ چوری سے متعلق میڈیا کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا "یہ چوری نہیں ڈکیتی ہے" لیکن ایس آئی ٹی کی رپورٹ کے بعد یوپی حکومت کی کارروائی پر عام لوگ سوال کر رہے ہیں کہ کارروائی تو صرف چوروں کے خلاف ہوئی ہے ڈاکو ابھی بھی آزاد گھوم رہے ہیں۔ واضح رہے کہ ایس آئی ٹی کی ابتدائی رپورٹ کی بنیاد پر آٹھ افراد کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا ہے۔ ان میں مندر ٹرسٹ کا کوئی بھی رکن شامل نہیں ہے صرف رما شنکر یادو عرف ٹنو جیسے چھوٹے ملازم اور مندر ٹرسٹ کے کارکن لوکیش مشرا، سنکلپ مشرا اور منیش یادو سمیت کل آٹھ افراد کے خلاف نامزد رپورٹ درج ہے دیگر نامعلوم ملزمین کے خلاف جانچ چل رہی ہے۔ عام آدمی پارٹی سربراہ اروند کیجریوال نے ایودھیا میں رام مندر درشن کے بعد چڑھاوں کی چوری پر زبردست تنقید کی ہے۔ انہوں نے مجرموں کو پھانسی پر لٹکانے کا مطالبہ کیا ہے۔ کیجریوال نے کہا کہ ایودھیا میں مہاپاپ ہوا ہے۔ ایف آئی آر ایک چھلاوہ ہے صرف دکھاوے کے لیے چھوٹے ملازمین پر کارروائی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے عاپ لیڈر سنجے سنگھ ایس آئی ٹی کو 13 دستاویزات حوالے کر چکے ہیں جس میں رام مندر کے آس پاس اراضی کی خرید و فروخت میں دھاندلی کے ثبوت ہیں۔ یہ ساری زمینیں چمپت رائے نے ہی خریدی یا بیچی ہیں لیکن ایس آئی ٹی کی رپورٹ یا ایف آئی آر میں ان کا کہیں نام شامل نہیں ہے۔ لکھنو کے سیاسی حلقوں میں خبر گرم ہے کہ وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ چمپت رائے اور ان کی ٹیم سے خاصے ناراض ہیں لیکن سخت کارروائی سے ہچکچا رہے تھے، اسی لیے انہوں نے محکمہ اطلاعات کے عملے سے ان کے استعفے کی خبر پہلے ہی چلوا دی جبکہ چمپت رائے نے ابھی تک میڈیا کے سامنے نہیں آتے ہیں۔

عام آدمی پارٹی کے رکن پارلیمنٹ سنجے سنگھ کا کہنا ہے کہ چمپت رائے ہی سب سے بڑے چور ہیں لیکن انہیں بچانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اب انہیں کون بچا رہا ہے اس کا جواب فی الحال کوئی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

آر ایس ایس کی خاموشی اور چمپت رائے کا استعفی!

رام مندر ٹرسٹ کے جنرل سکریٹری چمپت رائے نے بھلے ہی اپنے عہدے سے استعفی دے دیا ہو لیکن ٹرسٹ کی جانب سے اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ پی ایم او کے حکم پر ایودھیا کے ضلع کلکٹر نے مندر ٹرسٹ سے حساب کتاب طلب کیا تھا لیکن ٹرسٹ کے جنرل سکریٹری چمپت رائے نے ایس آئی ٹی کی جانچ کا حوالہ دے کر بینک اکاؤنٹس و دیگر مالی تفصیلات دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس معاملے میں آر ایس ایس کی خاموشی پر سب کو حیرت ہے۔ چمپت رائے آر ایس ایس کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں۔ کچھ دن پہلے بی جے پی کے سابق رکن پارلیمنٹ برج بھوشن شرن سنگھ نے کہا تھا "اس معاملے میں بہت بڑے بڑے لوگ ہیں اگر سچ بولوں گا تو خود بھی تنازعہ میں پھنس سکتا ہوں اسی وجہ سے نہیں بول رہا ہوں" سوال یہ ہے کہ آخر وہ بڑے لوگ کون ہیں برج بھوشن جیسا پہلوان جن کا نام لینے سے ڈر رہا ہے؟

مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ اور ان کا خاندان زمین گھپلے میں پھنسے

کانگریس رکن پارلیمنٹ راجیو شکلا نے بی جے پی کے مندر پر کوشٹھوں پر اہم سوال اٹھایا ہے۔ انہوں نے دلی میں پارٹی کی طرف سے بیان جاری کرتے ہوئے بتایا کہ بی جے پی نے اپنی تنظیم میں مندر پر کوشٹھ یعنی مندروں سے متعلق شعبے بنانے ہیں۔ کیا یہ مندر ٹرسٹوں پر قبضہ کر کے ان کے فنڈز کو سیاسی استعمال کے لیے کیا جا رہا ہے؟ یہ سوال کافی اہم ہے۔ بی جے پی کے علاوہ کسی بھی سیاسی جماعت کے پاس مندروں کا شعبہ نہیں ہے۔ یوپی میں ایودھیا، متھرا اور کاشی بی جے پی کے لیے کتنے فائدے مند ثابت ہوئے ہیں یہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ تاہم اب بی جے پی کا سیاسی کھیل اجاگر ہونے لگا ہے۔ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ موہن سنگھ یادو اور ان کے خاندان پر بھی الزام لگ رہا ہے کہ انہوں نے اجین میں بڑے پیمانے پر زمینیں خریدی ہیں۔ واضح رہے کہ اجین میں مہاکال مندر ہے اور اگلا سنگھستھ کنبھ میلہ اجین میں ہی ہونے والا ہے جس کے آس پاس بڑے پیمانے پر ترقیاتی کام ہونے والے ہیں۔ کانگریس پارٹی نے الزام لگایا ہے کہ اجین میں پانچ سو کروڑ روپے کی زمین ایک ٹرسٹ کو صرف ایک روپیے میں دی گئی جو وزیر اعلیٰ موہن یادو کے ثقافتی مشیر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سیاست میں کوئی کسی کا رشتہ دار نہیں ہوتا لیکن مدھیہ پردیش کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ اتر پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ اور سماجوادی پارٹی کے سربراہ اکھلیش یادو نے موہن یادو کا دفاع کرتے ہوئے بی جے پی پر انہیں ہٹانے کے لیے بدنام کرنے کا الزام لگایا ہے۔ ایوش تیواری نام کے ایک صارف نے طنز کرتے ہوئے ایکس پر لکھا "اب کچھ نہیں گے تو سماج وادیوں کو برا لگ جائے گا۔ بھگوان کے نام پر دھرم نگری اجین میں موہن یادو نے زمین کی لوٹ کی تو اکھلیش یادو بھائی چارہ نبھانے میں لگے ہیں" یاد رہے کہ اکھلیش یادو نے کہا تھا کہ بی جے پی تین ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کو بدلنا چاہتی ہے اسی لیے موہن یادو کو ٹارگٹ کیا جا رہا ہے۔

راجستھان میں مساجد کے خلاف کارروائی پر ہندو فرقہ احتجاج میں مسلمانوں کے ساتھ

شمالی ہند کی کئی ریاستوں میں مساجد اور مزارات کے خلاف کارروائی چل رہی ہے، خاص طور پر یوپی اور اتراکھنڈ میں مسلمانوں کی عبادت گاہیں نشانے پر ہیں۔ راجستھان کے سرحدی علاقوں میں تقریبا 350 مساجد کو نوٹس جاری کیے گئے ہیں۔ ضلع باڑمیر میں بی ایس ایف آپریشن کلین چلا رہی ہے۔ اس علاقے میں ہندو بھی انتظامیہ کی رویے سے خوش نہیں ہیں۔ باڑمیر میں مسجدوں کی انہدامی کارروائی کے خلاف ہندو طبقہ مسلمانوں کے ساتھ سڑکوں پر نکل آیا ہے۔ انہوں نے باڑمیر ضلع کلکٹر کے دفتر کے باہر احتجاجی مظاہرہ کیا ہے۔ اے پی سی ار کے جنرل سکریٹری ندیم خان کا کہنا ہے کہ سرحری علاقوں میں دیگر مذاہب کی عبادت گاہیں ہیں لیکن صرف مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو ہی سلامتی کے لیے خطرہ کیوں بتایا جا رہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کو ان علاقوں سے بھگانے کی سازش ہو رہی ہے لیکن غیر مسلموں کے مسلمانوں کے ساتھ آنے سے انتظامیہ کے تیور میں نرمی ائی ہے۔ اے پی سی ار نے اس سلسلے میں دلی میں پریس کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں دستور ہند کی پاسداری اور اقلیتوں کے حقوق اور تحفظ کا مطالبہ کیا گیا، ساتھ ہی اپوزیشن سے اپیل کی گئی کہ مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی نا انصافی کے خلاف اواز اٹھائیں۔ پریس کانفرنس میں عیسائی رہنما و سماجی کارکن جان دیال نے اقلیتی اداروں کے خلاف کارروائی پر تشویش ظاہر کی۔ ندیم خان نے وارانسی کی دال منڈی میں توسیع کاروائی کے دوران معاوضے میں دھاندلی کا بھی الزام لگایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ دال منڈی کے متاثرین کو کمرشیل پراپرٹی کا معاوضہ رہائشی جائیداد کے حساب سے دیا جا رہا ہے جس سے کروڑوں روپے کی جائیداد کا معاوضہ صرف چند لاکھ روپے مل رہا ہے۔

منصف کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش

مدھیہ پردیش سے ایک تشویش ناک خبر وائرل ہوئی ہے۔ اطلاعات کے مطابق ہندوتوادی کارکنوں نے ایک ایسے جج کے خلاف احتجاعی مظاہرہ کیا جس نے ماب لنچنگ کے الزام میں چودہ مجرموں کو عمر قید کی سزا سنائی ہے۔ گئو رکھشا پریشد سے وابستہ ان مجرموں نے ناظر احمد کو گئو کشی کے شک میں پیٹ پیٹ کر مار ڈالا تھا۔ مسلم وائس میل کے ایکس ہینڈل پر شیئر کی گئی اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ایک صارف نے لکھا کہ جج کا فیصلہ بالکل صحیح ہے۔ احتجاج کرنے والی بھیڑ کے خلاف مقدمہ درج ہونا چاہیے اور انہیں انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کرنا چاہیے تاکہ سماج دشمن عناصر غنڈوں کے لیے نظیر قائم ہو سکے۔" جب قاتلوں کی حمایت میں بھیڑ سڑکوں پر اترے، انصاف کرنے والے جج کا پتلا جلایا جائے، اس کی مذہبی شناخت کو نشانہ بنایا جائے تو یہ صرف احتجاج نہیں بلکہ قانون اور عدلیہ کو چیلنج ہے جسے جمہوری نظام میں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

محرم کے جلوس میں پاکستان زندہ باد نعرے کا پردہ فاش

بریلی کی کہائی کھیڑا گاؤں میں محرم کے دوران تعزیہ جلوس نکل رہا تھا اس دوران کچھ شر پسند عناصر نے بچوں سے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگوائے اور بعد میں ویڈیو وائرل کر دیا۔ پولیس نے جانچ کی تو پتہ چلا یوگیندر پال نام کے ہندو نوجوان نے مسلم بچوں سے متنازعہ نعرے لگوائے تھے جس سے علاقے میں کشیدگی پھیل گئی۔ پولیس نے بروقت کارروائی کرتے ہوئے اسے جیل بھیج دیا ہے۔ وائرل ویڈیو میں یوگیندر پال کی آواز بھی ریکارڈ ہو گئی تھی جس سے پولیس کو سمجھنے میں نہیں لگی ورنہ محرم کے دوران سماجی منافرت پھیلانے کی پوری سازش رچی گئی تھی۔

مذکورہ دونوں واقعات یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ ملک میں ہندو مسلم منافرت کس حد تک پھیل گئی ہے۔ چند سیاسی جماعتیں ووٹوں کی فصل کاٹنے کے لیے منافرت کی اس کھیتی کو کھاد پانی فراہم کر رہی ہیں لیکن ملک کی اکثریت اس سے اوب چکی ہے۔ وقتاً فوقتاً اس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ مسلم تنظیموں کو ایسے افراد کی قدر کرنا چاہیے اور نفرت کے ماحول کو کم کرنے کے لیے انہیں خود ہی اقدامات کرنے چاہئیں۔ خدمت خلق اور عمدہ اخلاق کا مظاہرہ مسلمانوں کے لیے ماحول سازگار بنانے میں کافی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

تو صاحبو، یہ تھا شمال کا حال، آئندہ ہفتے پھر ملیں گے کچھ تازہ اور دلچسپ احوال کے ساتھ، تب تک کے لیے اللہ اللہ خیر سلا۔

قرآن کی روشنی میں ایمان کی تین منزلیں

بسلسلہ صفحہ نمبر۔18

پھر فرمایا: "مجھے فارس کی سلطنت دکھائی گئی" اس وقت مسلمان بھوک، خوف اور محاصرے میں تھے، منافق ہنس رہے تھے مگر صحابہ نے فوراً تصدیق کی۔ بعد میں شام اور فارس فتح ہوئے اور علم الیقین حق الیقین میں بدل گیا۔ حضرت عمرؓ کا حال یہ تھا کہ قرآن سنتے تو روتے رہتے۔ ایک بار سورۂ طور کی آیت إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ سن کر کئی دن بیمار رہے۔ یہ حق الیقین کی کیفیت تھی۔ صحابہ کا ایمان علم الیقین سے آگے بڑھ کر حق الیقین تک پہنچ چکا تھا؛ جنت کا ذکر سنتے تو گویا اسے دیکھ رہے ہوتے اور جہنم کا ذکر سنتے تو کانپ اٹھتے۔ ان کا اللہ کے وعدوں پر یقین ایسا تھا جیسے ہم سورج کو دیکھتے ہیں۔ حق الیقین دراصل ایمان کا وہ درجہ ہے جو کردار، اخلاق، شکر، ایثار، صبر اور توکل بن کر ظاہر ہوتا ہے۔

قرآن اللہ کا کلام ہے اور اپنی آیات سے پہلے علم الیقین پیدا کرتا ہے، پھر موت، برزخ، قیامت اور جنت و جہنم کے مناظر کے ذریعے عین الیقین کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ جب بندہ قرآن کے مطابق زندگی گزارتا ہے تو اسے ایسے ایمانی تجربات حاصل ہوتے ہیں جو حق الیقین تک پہنچاتے ہیں۔ صبر، شکر، توکل، دعوت اور آزمائشیں ایمان کو پختہ کرتی جاتی ہیں۔ ہر امتحان اگلے مرحلے کی تیاری بن جاتا ہے اور ہر نیکی یقین میں اضافہ کرتی ہے۔ یہاں تک کہ مومن کا یقین حق الیقین میں ڈھل جاتا ہے۔

اگر کسی بندہ کی دعا قبول نہیں ہوتی کہ اس کو شفاء حاصل ہو جائے۔ اس صورت میں بھی اس پر اللہ تعالیٰ سکینت نازل فرماتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کے لیے اللہ سے ملاقات کا وقت قریب آ گیا ہے۔ وہ مرض کی تکلیف میں بھی جنت کی آسائشوں کا تصور کرتا ہے کہ عنقریب وہ اس دنیائے فانی کو چھوڑ کر اللہ کی نعمتوں والی زندگی میں منتقل ہونے والا ہے۔ یہی حال غزہ کے مسلمانوں کا ہے جو انتہائی صبر آزما دور سے گزر رہے ہیں لیکن وہ جنت کے تصورات میں جی رہے ہوتے ہیں کہ عنقریب یہ عارضی اذیت والی زندگی سے نعمت بھری ابدی زندگی میں منتقل ہونے والے ہیں۔ یہ کیفیت عین الیقین سے حاصل ہوتی ہے۔

غزہ، اقوامِ متحدہ اور مودی حکومت کی خاموشی

جسٹس سریدھرن کمیشن کی رپورٹ: بچوں پر مظالم کا عالمی فردِ جرم

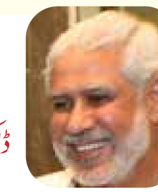

انصاف پسند ہندوستانی دل فلسطین اور مفاد پرست اقتدار اسرائیل کے ساتھ

ڈاکٹر سلیم خان، ممبئی

اقوام متحدہ کے پاس قوت نفاذ کا فقدان ہے، جب انسانی حقوق کی پامالی کے حوالے سے وہاں کوئی معاملہ زیر بحث آتا ہے یا اس کی گونج سارے عالم میں سنائی دیتی ہے۔ اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے آج بھی اتنے معتبر ہیں کہ ان کے ذریعہ سے جاری کردہ رپورٹ منظر عام پر آتے ہی بین الاقوامی شہرت اختیار کر لیتی ہے اور اسے جانبدار کہہ کر مسترد کر دینا آسان نہیں ہوتا۔ اسرائیل کو اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہمیشہ ایسا کرنا پڑتا ہے لیکن دنیا کا کوئی ملک اسرائیلی ہٹ دھرمی کی تائید نہیں کرتا۔ عام طور پر اسے تسلیم کر لیا جاتا ہے یا نظر انداز کر کے خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے۔ طوفان الاقصیٰ اور اس سے جنم لینے والے تصادم سے بہت پہلے اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل نے مقبوضہ فلسطینی علاقوں بشمول مشرقی یروشلم اور اسرائیل میں بین الاقوامی انسانی قوانین کی مبینہ خلاف ورزیاں درج کرنے کے لیے 27 نومبر 2021 کو ایک آزاد بین الاقوامی تحقیقاتی کمیشن قائم کیا تھا۔ اس وقت کونسل نے ایک قرارداد منظور کر کے کمیشن آف انکوائری سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ بار بار کی کشیدگی، عدم استحکام اور تنازعہ کی طوالت سے متعلق تمام بنیادی وجوہات کی تحقیقات کرے۔ اس تفتیش میں قومی، نسلی، نسلی یا مذہبی شناخت کی بنیاد پر امتیاز اور منظم جبر پر توجہ دینے کی تلقین کی گئی تھی۔

ابھی حال میں (23/جون 2026) کو مقبوضہ فلسطین میں انسانی حقوق کی صورتحال جاننے کے لیے قائم کردہ اقوام متحدہ کے آزاد بین الاقوامی تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اعتراف کیا کہ اسرائیلی حکام اور سیکیورٹی فورسز غزہ پٹی اور مغربی کنارے میں نسل کشی، انسانیت کے خلاف جرائم اور جنگی جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ مذکورہ بالا کمیشن کے سربراہ (سابق) جسٹس سری نواسن مرلیدھر ہیں۔ یہ وہی سابق جج ہیں جنہوں نے دہلی فسادات کے دوران کپل مشرا کی دھمکی آمیز ویڈیو کو دیکھ کر دہلی پولیس سے پوچھا تھا کہ اس شخص کے خلاف ایف آئی آر کب داخل کی جائے گی؟ نتیجے میں اگلی صبح انہیں چنڈی گڑھ ہائی کورٹ تبادلہ کر دیا گیا اور پھر ان کو دہلی لوٹ کر آنا نصیب نہیں ہوا یہاں تک کہ وہ اڈیشا میں سبکدوش ہو گئے۔ اس کے برعکس جس کپل مشرا کو سزا سے بچانے کے لیے اس کے ساتھ یہ ناانصافی کی گئی اس کو بی جے پی کی دہلی سرکار نے وزیر قانون بنا کر بتا دیا کہ بھگواٹولے کے نزدیک قانون اور انصاف کا مطلب کیا ہے؟

حکومت ہند نے جس انصاف پسند جج کی ناقدری کی اس کو اقوام متحدہ نے ایک اہم رپورٹ مرتب کرنے کی سربراہی کا اعزاز بخشا اور ان کے تحت کام کرنے والے کمیشن نے اپنی تازہ ترین رپورٹ میں بتایا کہ اسرائیلی عسکری کارروائیوں کی شدت اور منظم نوعیت بدستور جاری ہے جس کے نتیجے میں فلسطینی بچوں کے ہلاک و زخمی ہونے اور ذہنی صدمات کی سطح تاریخ کی بلند ترین حدود کو چھو رہی ہے۔ رپورٹ میں زور دیا گیا کہ حالیہ جنگ میں بچوں کو جان بوجھ کر نشانہ بنائے جانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسرائیلی حکام اور سیکیورٹی فورسز غزہ میں فلسطینی آبادی کو مکمل یا جزوی طور پر تباہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کمیشن کے چیئرمین نے یہ دردناک انکشاف بھی کیا کہ اکتوبر 2025 کی جنگ بندی کے بعد بھی بچے مسلسل ہلاک اور زخمی ہو رہے ہیں نیز، اسرائیل جنگ بندی اور بین الاقوامی قانون کے تحت فلسطینی بچوں کے تحفظ سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو مسلسل نظر انداز کر رہا ہے۔ انہوں نے شواہد کی بنیاد پر برملا کہا کہ فلسطینی بچوں کو اسرائیلی سیکیورٹی فورسز نے دانستہ طور پر قتل کیا، ان کو شدید جسمانی اور ذہنی زخم، اجتماعی نفسیاتی صدمات، یتیمی، خاندانوں سے جدائی، معذوری، بار بار نقل مکانی اور بھوک کا شکار ہونا پڑا۔

اسرائیل کے مکروہ چہرے پر پڑی تہذیب و ثقافت کی جعلی نقاب کو نوچ کر پھینکنے والی اس رپورٹ میں یہ انکشاف کیا گیا کہ ان ظالموں نے نومولود بچوں کو بھی نہیں بخشا۔ انہوں نے غزہ میں زچگی اور نومولود بچوں کی نگہداشت کے مراکز کو نشانہ بنا کر فلسطینیوں کے مستقبل کو براہ راست نقصان پہنچایا۔ اسرائیلی مظالم کے نتیجے میں نہ صرف اسقاط حمل کے واقعات میں اضافہ ہوا بلکہ نومولود بچوں میں پیدائشی نقائص اور طویل مدتی طبی مسائل پیدا ہو گئے۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق اسرائیلی ناکہ بندی کے باعث مسلط کی جانے والی بھوک نے متعدد فلسطینی بچوں کی جان لے لی اور جو بچ گئے ان میں سے لاکھوں خوراک کی کمی، حفاظتی ٹیکوں کی محدود دستیابی، بیماریوں کے بڑھتے ہوئے خطرات اور نظامِ صحت کی تباہی سے دوچار ہو گئے۔ بچوں پر مظالم محض غزہ تک محدود نہیں تھے بلکہ مشرقی یروشلم سمیت مغربی کنارے میں یتیم خانوں اور تعلیمی اداروں کو تباہ کر کے بچوں کی ذہنی، سماجی اور جذباتی نشوونما میں رکاوٹ پیدا کی گئی تاکہ فلسطینی معاشرے کی بنیادوں کو کمزور کیا جائے۔ صہیونی مقتدرہ کی سفاکی نے توہلاکو اور ہٹلر کی روحوں کو بھی شرمندہ کر دیا ہے۔

جسٹس سریدھرن کے کمیشن نے ان اسرائیلی فوجی یونٹوں کی نشاندہی کر کے کہ جو فلسطینی بچوں کی ہلاکتوں اور تعذیب میں ملوث تھے اسرائیل اور اقوام متحدہ کے تمام رکن ممالک سے مبینہ جرائم کے ذمہ داروں کا محاسبہ کرنے کا پرزور مطالبہ کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ غزہ اور مغربی کنارے میں بمباری اور گولہ باری کے بند ہو جانے پر بھی فلسطینی بچوں کی زندگی فوراً معمول پر نہیں آسکے گی کیونکہ ان کی صحت، تعلیم اور نشوونما کا نقصان ناقابل تلافی ہے، لیکن اگر جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو سزا ملے تو ان میں تحفظ، امید اور مستقبل کا اعتماد پیدا ہوگا۔ اسرائیلی سفاکی چونکہ بچوں کو کھیلنے، خواب دیکھنے، امید رکھنے اور اپنی شناخت تشکیل دینے کی آزادی کو متاثر کر رہی ہے اس لیے کمیشن نے اسرائیل سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ فلسطینی بچوں کے حقوق کی تمام پامالیوں اور ان کے خلاف جرائم کا سلسلہ فوری طور پر بند کرے۔ اس رپورٹ میں اسرائیل سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عالمی عدالت انصاف کی مشاورتی رائے کے مطابق مقبوضہ مغربی کنارے، بشمول مشرقی یروشلم میں اپنی موجودگی ختم کرے۔ اقوام متحدہ کی اس رپورٹ کو ٹرمپ انتظامیہ اگر سنجیدگی سے لے کر اسرائیل کی نکیل کسے تبھی اس کی عقل ٹھکانے آسکتی ہے۔

گجرات سے لے کر منی پور تک خوں آشام ریکارڈ رکھنے والی مودی سرکار پر تو اس رپورٹ کا کوئی اثر ہونا ممکن ہی نہیں تھا، لیکن اس نے کانگریس کی رہنما سونیا گاندھی کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا اور انہوں نے انڈین ایکسپریس میں ایک طویل مضمون لکھ کر فلسطینی مظلومین کے تئیں اپنی تائید و حمایت کا اعلان کیا۔ ان کے مطابق ہندوستانی قومیت کی اصل روح اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم اپنے فلسطینی بھائیوں اور بہنوں کے حق میں آواز اٹھائیں، جن کے بچوں کو اسرائیل نے بے رحمی سے نشانہ بنایا ہے۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ وزیر اعظم مودی اٹلی کی وزیر اعظم جارجیا میلونی کے ساتھ تو خوب ہنسی مذاق کرتے ہیں مگر اسی ملک سے آنے والی ہندوستانی بہو کی باتوں پر توجہ نہیں کرتے۔ سونیا گاندھی نے یاد دلایا کہ ستمبر 2025 میں مقبوضہ فلسطینی علاقوں سے متعلق اقوام متحدہ کے آزاد بین الاقوامی تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ غزہ میں فلسطینیوں کے خلاف اسرائیلی حکام ایسے اقدامات کر رہے ہیں جو نسل کشی کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس وقت بھی مودی حکومت نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی اور زبان پر قفل لگا ہوا تھا مگر پرینکا گاندھی نے اس کی پرزور مذمت کر کے تمام ہندوستانیوں کی جانب سے گویا فرض کفایہ ادا کیا تھا۔ انہوں نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ اسرائیل فلسطین میں نسل کشی کر رہا ہے۔ انہوں نے 'ایکس' پر لکھا کہ

سونیا گاندھی

نریندر مودی، وزیر اعظم

> حکومت ہند نے جس انصاف پسند جج کی ناقدری کی اس کو اقوام متحدہ نے ایک اہم رپورٹ مرتب کرنے کی سربراہی کا اعزاز بخشا اور ان کے تحت کام کرنے والے کمیشن نے اپنی تازہ ترین رپورٹ میں بتایا ہے کہ اسرائیلی عسکری کارروائیوں کی شدت اور منظم نوعیت بدستور جاری ہے جس کے نتیجے میں فلسطینی بچوں کے ہلاک و زخمی ہونے اور ذہنی صدمات کی سطح تاریخ کی بلند ترین حدود کو چھو رہی ہے۔ رپورٹ میں زور دیا گیا کہ حالیہ جنگ میں بچوں کو جان بوجھ کر نشانہ بنائے جانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسرائیلی حکام اور سیکیورٹی فورسز غزہ میں فلسطینی آبادی کو مکمل یا جزوی طور پر تباہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کمیشن کے چیئرمین نے یہ دردناک انکشاف بھی کیا کہ اکتوبر 2025 کی جنگ بندی کے بعد بھی بچے مسلسل ہلاک اور زخمی ہو رہے ہیں نیز، اسرائیل جنگ بندی اور بین الاقوامی قانون کے تحت فلسطینی بچوں کے تحفظ سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو مسلسل نظر انداز کر رہا ہے۔

اسرائیل نے '60 ہزار سے زائد افراد کو قتل کیا ہے جن میں 18 ہزار چار سو 30 بچے شامل ہیں۔' پرینکا گاندھی کے مطابق اسرائیل نے بچوں سمیت سیکڑوں افراد کو بھوکا مار دیا ہے اور لاکھوں کو بھوک سے مارنے کی دھمکی دے رہا ہے۔ پرینکا گاندھی نے اس موقع پر خاموشی اور بے عملی کے ذریعے ان جرائم کی بالواسطہ پشت پناہی کو مودی سرکار کا ایک جرم قرار دیا تھا۔ پرینکا کے الفاظ میں 'یہ شرمناک ہے کہ حکومتِ ہند ایک ایسے وقت خاموش تماشائی بن کر کھڑی ہے جب اسرائیل فلسطینی عوام کو تباہ کر رہا ہے۔' مودی سرکار کو آڑے ہاتھوں لینے والی پرینکا گاندھی کے اس چشم کشا بیان سے بھی حکومتِ ہند نے تو آنکھیں موند لیں مگر نئی دہلی میں اسرائیل کے سفیر روون آزار اسے برداشت نہیں کر سکے اور پرینکا گاندھی کے بیان کو 'شرمناک' قرار دے دیا۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق آزار نے ایکس پر لکھا کہ 'اسرائیل نے حماس کے 25 ہزار جنگجوؤں کو مارا ہے۔ انسانی جانوں کا یہ خوفناک نقصان حماس کی گھناؤنی حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے جس میں وہ عام شہریوں کے پیچھے چھپتے ہیں، ان لوگوں پر فائرنگ کرتے ہیں جو انخلا یا امداد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور راکٹ داغتے ہیں۔' اسرائیلی سفیر نے جھوٹ کی تمام حدود کو پھلانگتے ہوئے لکھا کہ ان کے ملک نے غزہ میں 20 لاکھ ٹن خوراک پہنچائی 'یہاں کوئی نسل کشی نہیں ہو رہی۔ حماس کے اعداد و شمار پر یقین نہ کریں۔

وہ احمق بھول گیا کہ یہ حماس کی نہیں بلکہ اقوام متحدہ کی رپورٹ ہے۔ اسرائیل کو اگر اقوام متحدہ سے اس قدر پریشانی ہے تو اس سے نکل جائے لیکن وہ ایسا بھی نہیں کر سکتا اس لیے بادلِ نخواستہ اس سے چپکا ہوا ہے۔ اسرائیلی سفیر کے جواب میں اس وقت کانگریس کے ترجمان ادتیہ گرگ نے ایکس پر لکھا تھا کہ 'تم کون ہوتے ہو غزہ میں خوراک پہنچانے والے؟ بس فلسطین اور غزہ سے دور رہو۔ دنیا بھر کے لوگ ان کا خیال رکھیں گے، تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔'

ایکس کی معروف صارف پنکھڑی پھاٹک نے اسرائیلی سفیر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ 'اب کوئی بھی آپ کے جھوٹ پر یقین نہیں کرتا۔ اسرائیل ایک دہشت گرد ریاست ہے۔ تم بچوں کو قتل کرتے ہو۔ بے سہارا لوگوں کو قتل کرتے ہو۔ تم انہیں اس لیے قتل کرتے ہو کیونکہ تم ان کی زمین چاہتے ہو۔ تمہارا نام تاریخ میں ہٹلر کے ساتھ لکھا جائے گا اور ایک دن، اس زندگی میں یا اگلی زندگی میں تم کو اپنے جرائم کے نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔' اس جواب کو دیکھ کر صہیونی سفیر کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ حکومتِ ہند کے برعکس ہندوستانی عوام کا ضمیر ابھی زندہ ہے۔ حالیہ رپورٹ بتاتی ہے کہ اسرائیل نے تعلیم و صحت کے نظام کو تباہ کر کے غزہ کے بچوں سے ان کا بچپن چھین لیا ہے اور ایسے اثرات چھوڑے ہیں جو زندگی بھر ان کے ساتھ رہیں گے۔ ان بچوں کو گرفتاری کے بعد جیلوں اور حراستی مراکز میں تشدد اور سنگین بدسلوکی کا نشانہ بنایا گیا نیز، کئی بچوں کے قید خانوں کی معلومات تک نہیں فراہم کی گئیں۔ اسرائیلی حفاظتی اہلکاروں نے بچوں کے خلاف جنسی تشدد کو اجتماعی تذلیل اور جبر کا ذریعہ بنایا جو نسلی، صنفی اور بین النسلی امتیاز کا نمونہ ہے۔

اقوام متحدہ کی یہ رپورٹ ایک بار پھر انتہائی دردناک انداز میں اس مؤقف کو دہراتی ہے کہ اسرائیل کی کارروائیوں کا مقصد غزہ میں فلسطینیوں کی اجتماعی موجودگی کو ختم کرنا ہے، اور اسی لیے بچوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ رپورٹ ایک سوچی سمجھی حکمتِ عملی ہے جو اب تک کم از کم 20 ہزار فلسطینی بچوں کے جاں بحق ہونے اور 44 ہزار سے زائد کے زخمی یا معذور ہونے کا انکشاف کرتی ہے۔ فی الحال غزہ کے 97 فیصد اسکول تباہ کر دیے گئے ہیں۔ ایسے میں وزیر اعظم مودی کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ وہ کس کے ساتھ کھڑے ہو کر عالمی دہشت گردی کے خاتمے کا پروچن دیتے ہیں کیونکہ انسان کی پہچان اس کے دوستوں سے ہوتی ہے۔ سونیا گاندھی نے اس تباہی کے لیے اسرائیل کے وزیر اعظم نیتن یاہو اور ان کی کابینہ کے سینئر ارکان سمیت اعلیٰ ترین رہنماؤں کو ذمہ دار ٹھیرایا اور ان کے متعدد مواقع پر غزہ کے لیے "مکمل محاصرہ" اور "مکمل تباہی" جیسے الفاظ استعمال کرنے کی یاد دہانی کرائی ہے۔ سونیا گاندھی نے بتایا کہ بعض اسرائیلی رہنماؤں نے فلسطینیوں کو جانور قرار دیا اور کہا کہ انہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اسرائیل کی کامیابی اسی وقت ممکن ہوگی جب تمام فلسطینی غزہ چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

کانگریسی رہنما نے ان مظالم کے لیے ٹرمپ کو بھی ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔ سونیا گاندھی نے امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ پر بھی تنقید کی کیونکہ انہوں نے اسرائیلی درندگی کی حمایت جاری رکھی جس سے فلسطینیوں کے خلاف فوجی کارروائی کا راستہ آسان ہوتا چلا گیا۔ ان کے مطابق امریکی رکاوٹوں اور ویٹو کی سیاست کے باعث اقوامِ متحدہ اسرائیل کے خلاف کسی مؤثر اور فیصلہ کن کارروائی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا، تاہم اس کے مختلف اداروں نے غزہ میں اسرائیلی جنگی جرائم کی دستاویز بندی اور شواہد جمع کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ سونیا گاندھی نے کہا کہ جنوبی افریقہ نے تو 1948ء کے کنونشن برائے انسدادِ نسل کشی کی مبینہ خلاف ورزیوں کے الزام میں اسرائیل کے خلاف بین الاقوامی عدالتِ انصاف سے رجوع کرنے کی جانب توجہ دلائی تھی جس میں بین الاقوامی فوجداری عدالت نے اسرائیلی سیاسی قیادت کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری کیے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ متعدد یورپی ممالک نے اسرائیل کو اسلحہ فروخت کرنے پر پابندیاں عائد کی ہیں جبکہ لاطینی امریکہ کے کئی ممالک نے اسرائیل کے ساتھ اپنے سفارتی تعلقات یا تو محدود کر دیے ہیں یا مکمل طور پر منقطع کر دیے ہیں۔

سونیا گاندھی نے اسرائیل کے تئیں مختلف مغربی ممالک کے مؤقف میں نمایاں تبدیلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ کئی دہائیوں تک فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے سے گریز کرنے والے فرانس، برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا جیسے ممالک اب فلسطینی ریاست کو تسلیم کر چکے ہیں اور دنیا کے بہت سے ایسے ممالک، جن کے ساتھ ہندوستان کے قریبی سفارتی تعلقات ہیں، غزہ میں اسرائیل کی کارروائیوں کو نسل کشی قرار دے چکے ہیں۔ سونیا گاندھی کے مطابق ایسے میں مودی حکومت کی مسلسل خاموشی نہ تو عقلی بنیادوں پر قابلِ فہم ہے اور نہ ہی اخلاقی اعتبار سے اس کا دفاع کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے وہ حکومتِ ہند کو اپنی تاریخی خارجہ پالیسی، نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کی روایت، انسانی حقوق کے احترام اور عالمی انصاف کے اصولوں کے مطابق فلسطینی عوام کے حق میں آواز بلند کرنے کی تلقین کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک یہی ہندوستان کی تاریخی ذمہ داری، اخلاقی فریضہ اور قومی مفاد کا تقاضا ہے۔ یہ دلچسپ امر یہ ہے کہ گزشتہ سال ستمبر میں اقوام متحدہ کی رپورٹ ناوی پلائی نامی ہندوستانی نژاد جنوبی افریقہ کی جج نے تیار کروائی تھی۔ ان کے والدین تمل ناڈو سے ڈربن جا کر بس گئے تھے۔ امسال جون 2026 میں اسی کمیشن نے تمل ناڈو ہی کے رہنے والے جسٹس (ریٹائرڈ) ایس مرلیدھر کی سربراہی میں رپورٹ تیار کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انصاف پسند ہندوستانی دل فلسطین اور مفاد پرست اقتدار اسرائیل کے ساتھ ہے۔ ایسے میں ہم ہندوستانیوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم کس کے ساتھ ہیں؟

(ڈاکٹر سلیم خان نیوکلیر کیمسٹری میں پی ایچ ڈی ہیں جن کی تحریریں ملک و بیرونِ ملک بڑے پیمانے پر پڑھی جاتی ہیں۔)

تاریخ، تہذیب اور شناخت: ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش چیلنج

جب نصاب، میڈیا اور سینما ایک ہی کہانی سنانے لگیں

کلچر وار کے عہد میں نئی نسل کو اپنی جڑوں سے جوڑے رکھنے کی ذمہ داری

شبیع الزماں

ہندوستان کے موجودہ حالات مسلمانوں کے لیے سخت آزمائش اور گہرے سماجی چیلنج کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ایک منظم مہم کے ذریعے انہیں بدنام کیا جا رہا ہے اور دنیا کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس ملک کا سب سے بڑا مسئلہ مسلمان ہیں۔ عوامی شعور میں یہ تصور راسخ کیا جا رہا ہے کہ مسلمان اس ملک کا سرمایہ نہیں بلکہ اس پر ایک بوجھ ہیں۔ حالیہ برسوں میں "عبدل پنکچر والا" جیسے ریمارک، اسی ذہنیت اور بیانیے کی عکاسی کرتے ہیں۔

ملک سے مسلمانوں کی محبت، ان کی وفاداری اور سماج میں ان کے کردار کو بار بار سوالات کے دائرے میں لایا جا رہا ہے۔ ان کے مذہبی شعائر، لباس، زبان اور تہذیبی شناخت کو بحث کا موضوع بنایا جا رہا ہے۔ کبھی حجاب کو تنازع بنایا جاتا ہے، کبھی اذان کو، کبھی مدارس کو تو کبھی مسلم پرسنل لا کو۔ مسلمانوں کی ہر مذہبی یا تہذیبی علامت کو اختلاف اور کشمکش کا عنوان بنا دیا گیا ہے۔

اس پورے عمل کا مقصد محض سیاسی فائدہ حاصل کرنا نہیں بلکہ اکثریتی سماج کے ذہن میں مسلمانوں کے خلاف مستقل خوف اور نفرت کو راسخ کرنا بھی ہے۔ اس بیانیے کی تشکیل میں رائے عامہ کو متاثر کرنے والے تقریباً تمام ہی ذرائع استعمال کیے جا رہے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا، اخبارات، فلمیں، ویب سیریز، سوشل میڈیا اور سیاسی تقریریں مسلسل اس تصور کو تقویت دے رہی ہیں کہ مسلمان ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور انہیں ہندوستان کے سب سے بڑے مسئلے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس طرح ایک پوری قوم کی اجتماعی شناخت کو مشکوک بنا کر سماجی اور سیاسی سطح پر اس کے خلاف منظم ذہن سازی کی جا رہی ہے۔

سب سے پہلے ہندی سینما کا جائزہ لیتے ہیں جو عوامی ذہن سازی کا ایک طاقتور ذریعہ ہے اور سماج کے اندر مسلمانوں کے تعلق سے منفی تصورات پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

ہندی فلموں میں مسلمانوں کی منفی امیج اب محض چند کرداروں یا ڈائیلاگ تک محدود نہیں رہ گئی بلکہ یہ ایک منظم فکری و ثقافتی بیانیہ کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ خاص طور پر گزشتہ دو دہائیوں میں ایسی فلموں، ویب سیریز اور ٹی وی سیریلوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے جن میں مسلم شناخت کو خوف، تشدد، سازش اور عدم وفاداری کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا رہا ہے۔

اگر موجودہ ہندی فلموں، ویب سیریز اور ٹی وی مواد کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ پلیٹ فارمس رفتہ رفتہ اسلاموفوبیا کے مراکز بنتے جا رہے ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی تہذیب، مذہب، تاریخ اور سماجی شناخت کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ مسلم حکم رانوں کو اکثر ایک وحشی، غیر مہذب، ظالم، جنس زدہ اور ہندو مخالف کردار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جن کے پاس اقتدار تو تھا مگر تہذیب، اخلاق اور انسانی قدریں نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ مسلم حکم رانوں کی علمی خدمات، انتظامی صلاحیتوں اور مشترکہ تہذیبی وراثت کو نظر انداز کر کے صرف جنگ، خونریزی، محلاتی سازشوں اور مذہبی تنازعات کو نمایاں کیا جا رہا ہے۔

اسی طرح عام مسلمانوں کو بھی اکثر ایسے کرداروں میں دکھایا جاتا ہے جو دہشت گردی، جرائم، شدت پسندی یا ملک دشمن سرگرمیوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ مسلم محلوں، مدرسوں، مسجدوں اور مذہبی علامات کو اس انداز میں فلمایا جاتا ہے کہ ناظر کے ذہن میں خوف، اجنبیت یا عدمِ اعتماد کا احساس پیدا ہو۔

کئی فلموں اور سیریلوں میں مسلمان کردار ایک پسماندہ، دقیانوسی اور شدت پسند سماج کے نمائندے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ خاص طور پر ڈاڑھی، ٹوپی، اردو لہجہ اور مذہبی شناخت کو منفی کرداروں کے ساتھ اس طرح جوڑا جاتا ہے کہ ناظر کے ذہن میں ایک غلط تاثر قائم ہو جاتا ہے۔ بعض بیانیوں میں مسلمانوں کو زیادہ بچے پیدا کرنے والا، عورتوں پر ظلم کرنے والا اور سماج پر بوجھ بننے والا طبقہ بتایا جاتا ہے۔ ان کی حب الوطنی مسلسل شک کے دائرے میں رکھی جاتی ہے اور انہیں یا تو دہشت گرد، پاکستان کا ہمدرد یا ملک کے خلاف سازشیں کرنے والے گروہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

اسی تسلسل میں "لو جہاد" جیسے من گھڑت موضوعات کو بھی فلمی بیانیے کا حصہ بنایا گیا۔ مثال کے طور پر کیرالا اسٹوری جیسی فلموں کے ذریعے یہ تصور عام کرنے کی کوشش کی گئی کہ مسلمان نوجوان منظم سازش کے تحت ہندو لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھنسا کر ان کا مذہب تبدیل کرواتے ہیں اور پھر انہیں شدت پسند سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

بھارتی میڈیا مسلمانوں کے تعلق سے مستقل منفی بیانیہ کو فروغ دے رہا ہے۔ خاص طور پر ٹی وی نیوز چینلوں، پرائم ٹائم مباحثوں، سوشل میڈیا پلیٹ فارموں اور ڈیجیٹل میڈیا اداروں میں مسلمانوں کو اکثر ایسے انداز میں پیش کیا جاتا ہے جس سے سماج میں ان کے خلاف خوف، نفرت اور بداعتمادی پیدا ہو۔

مسلمانوں سے متعلق کسی بھی واقعہ کو غیر معمولی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر کسی جرم میں مسلمان ملوث ہو تو اس کی مذہبی شناخت کو نمایاں کیا جاتا ہے، لیکن یہی اصول خود کے معاملات میں اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ عوام کے ذہن میں یہ تصور بٹھایا جاتا ہے کہ جرائم، تشدد یا انتہاپسندی کا تعلق خاص طور پر مسلمانوں سے ہے۔

ٹی وی مباحثوں میں بھی ایسے موضوعات چنے جاتے ہیں جن کا مرکز مسلمان ہوتے ہیں، جیسے مدرسے، اذان، حجاب، لو جہاد، زیادہ بچے پیدا کرنا یا مسلم پرسنل لا وغیرہ۔ ان مباحثوں میں سنجیدہ علمی گفتگو کے بجائے اشتعال انگیزی، چیخ و پکار اور نفرت آمیز لب و لہجہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اینکرز اور مبصرین مسلمانوں کو دفاعی پوزیشن میں اور ان کے مذہب اور کمیونٹی کو کٹہرے میں کھڑا کرتے جس سے مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تعصب کو تقویت ملتی ہے۔

سوشل میڈیا نے اس مسئلے کو مزید سنگین بنا دیا ہے۔ جھوٹی خبریں، پرانے ویڈیوز، فرضی دعوے اور نفرت انگیز پروپیگنڈہ بہت تیزی سے پھیلایا جاتا ہے۔ کئی بار کسی مقامی واقعہ کو مذہبی رنگ دے کر پورے ملک میں مسلمانوں کے خلاف غصہ بھڑکانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حقیقت بہت بعد میں سامنے آتی ہے تب تک ابتدائی پروپیگنڈہ اپنا اثر چھوڑ چکا ہوتا ہے۔

یہ معاملات اب صرف یہیں تک نہیں رکے ہیں بلکہ اسکولوں تک پہنچ چکے ہیں۔ تعلیم کا بھگوا کرن کا پروجیکٹ تیز رفتاری سے جاری ہے۔ "تاریخ کے بھگوا کرن" سے مراد تاریخ کو ایک مخصوص ہندوتوا نظریے کے مطابق دوبارہ پیش کرنے کی وہ کوشش ہے جس میں ہندوستان کی ماضی کی تاریخ، تہذیب اور سیاسی ارتقاء کو ایک خاص مذہبی و نظریاتی زاویے سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اس عمل میں تاریخ کے پیچیدہ، متنوع اور کثیر الثقافتی کردار کو کمزور کر کے اسے "ہندو بمقابلہ مسلم" کے سادہ بیانیے میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔

تعلیمی نظام کی بھگواکاری کے نتیجے میں جہاں ہندو سماج میں اپنی تاریخ پر فخر کی روایات کو فروغ دیا جا رہا ہے، وہیں مسلمانوں کی تاریخ کو بتدریج پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔

مختلف ادوار میں این سی ای آر ٹی اور دیگر تعلیمی اداروں کی کتابوں میں بعض ابواب کو حذف یا تبدیل کیا گیا۔ مغل دور، مسلم حکم رانوں، دہلی کی سلطنت اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے کئی پہلوؤں کو یا تو مختصر کر دیا گیا یا منفی انداز میں پیش کیا گیا۔ دوسری طرف قدیم ہندوستان کو ایک "سنہری ہندو دور" کے طور پر پیش کرنے پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے جہاں بعض اوقات تاریخی حقیقت اور تہذیبی دعوؤں کے درمیان فرق دھندلا ہو جاتا ہے۔ مسلم حکم رانوں کو اکثر حملہ آور، ظالم یا مندروں کو توڑنے والا بنا کر پیش کیا جاتا ہے، جبکہ ان کی انتظامی صلاحیتوں، علمی سرپرستی، فنِ تعمیر، زبان، موسیقی، تجارت اور ہندوستانی تہذیب میں ان کے کردار کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح قدیم ہندوستان کے تعلق سے ایسے غیر معمولی دعوے بھی پیش کیے جا رہے ہیں

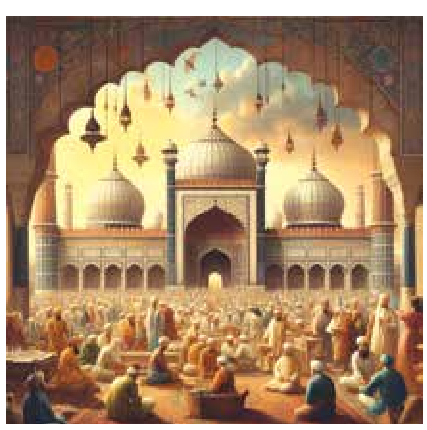

> موجودہ دور کی اصل جنگ صرف سیاسی یا قانونی نہیں بلکہ ثقافتی اور فکری بھی ہے۔ اگر نئی نسل کو اپنی تاریخ، تہذیب اور علمی سرمایہ سے مربوط نہ رکھا گیا تو اس میں احساسِ کمتری پیدا ہو سکتا ہے اور وہ منفی پروپیگنڈے کا آسان ہدف بن سکتی ہے۔ اسی لیے تاریخ کو محض ماضی کی داستان نہیں بلکہ زندہ شعور اور اجتماعی شناخت کی بنیاد کے طور پر پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

جنہیں جدید تاریخی اور سائنسی تحقیق سے ثابت نہیں کیا جا سکتا، جیسے یہ دعویٰ کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی تقریباً ہر اہم ایجاد قدیم ہندوستان میں موجود تھی۔ جیسے جہاز ہندوستان نے پہلے بنا لیا تھا، پلاسٹک سرجری ویدک دور میں ایجاد ہو چکی تھی اور اس طرز کے دوسرے عجیب و غریب دعوے کیے جا رہے ہیں جن کا سر ہے نہ پیر۔

اس طرح کے بیانیے کا مقصد تاریخی تحقیق سے زیادہ تہذیبی فخر اور سیاسی شناخت کو مضبوط کرنا ہے۔

شہروں، سڑکوں اور تاریخی مقامات کے نام تبدیل کرنے کا رجحان بھی اسی ذہنیت کا غماز ہے۔ یہ کوششیں صرف نام بدلنے تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک خاص تاریخی یادداشت کو مٹانے اور دوسری یادداشت کو نمایاں کرنے کی علامت ہے۔ مثال کے طور پر مغل یا مسلم ادوار سے وابستہ ناموں کو تبدیل کر کے قدیم ہندو شخصیات کا نام دینا ہے۔

یہ وہ تشویشناک حالات ہیں جن میں مسلمانوں کی نئی نسل پروان چڑھ رہی ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے اپنے تعلیمی، دینی اور تربیتی ادارے بھی بتدریج کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ آزادی کے بعد کے نہایت سخت حالات میں بھی مسلمان بڑی حد تک اپنی تہذیب، دینی شناخت اور تاریخی روایات کی حفاظت کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ وہ مضبوط ایکو سسٹم تھا جسے مسلمانوں نے خود تشکیل دیا تھا۔

اس میں دینی و تربیتی ادارے، اردو میڈیم اسکولز، مذہبی جماعتیں، گھریلو تربیت کا ماحول، اسلامی لٹریچر دینی رہنما اور اسکالرز شامل تھے۔ مجموعی طور پر اس نظام نے مسلمانوں کو سہارا دیا تھا، ان کی شناخت کو محفوظ رکھا اور انہیں اپنی تاریخ، تہذیب اور روایات سے جوڑے رکھا تھا۔ لیکن بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ یہ تمام ادارے اور تربیتی وسائل رفتہ رفتہ کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔

اردو زبان سے دوری کے سبب نئی نسل اپنے علمی و ادبی لٹریچر سے کٹتی جا رہی ہے۔ پچھلے دو سو سال کے علمی، ادبی اور مذہبی سرمایہ ادب سے وہ بیگانہ ہوتی جا رہی ہے۔ اقبال کی شاعری، شبلی کی تاریخ، آزاد کا درد بھرا پیغام، مولانا مودودی کا اسلامی لٹریچر، دیوبند کی تحریک، سرسید کی کاوشیں، قرآنِ مجید کی تفاسیر، احادیث کی تشریحات اور اپنے اسلاف کی تاریخ—ان سب سے وہ آہستہ آہستہ بیگانہ ہوتی جا رہی ہے۔

تیسری طرف دورِ جدید کا چیلنج کھڑا ہے۔ نئی نسل ایک مختلف مزاج، مختلف ترجیحات اور نئی ذہنی تشکیل کے ساتھ سامنے آ رہی ہے۔ ماہرین کے مطابق یہ نسل پچھلی تمام نسلوں سے خاصی مختلف ہے۔ یہ وہ نسل ہے جو مکمل طور پر ڈیجیٹل ماحول، اسمارٹ ٹیکنالوجی اور آرٹیفیشل انٹیلیجنس کے درمیان پروان چڑھ رہی ہے۔ بلاشبہ یہ نسل نہایت اسمارٹ ہے اور اس میں سیکھنے کی صلاحیت غیر معمولی ہے۔ لیکن بعض پہلو ایسے بھی ہیں جن میں اس نسل کو اصلاح اور درست رہنمائی کی شدید ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر، دیر تک سننا اور کسی موضوع پر گہرائی سے غور کرنا ان کے مزاج کا حصہ نظر نہیں آتا، جبکہ دنیا کے تمام علمی اور فکری میدان اسی گہرائی اور صبر کا تقاضا کرتے ہیں۔ خدشہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں تو یہ نسل آگے نکل جائے گی مگر علمی، فکری اور نظریاتی سطح پر کمزور رہ جائے گی۔ ویسے بھی جس ایکو سسٹم میں یہ نسل پرورش پا رہی ہے، وہاں سوچنے اور بات کو ہضم کرنے (پروسسنگ ٹائم) کا دورانیہ بہت مختصر ہے۔

یہ بچے مسلمانوں کی تاریخ، ان کی عظیم شخصیات، ہیروز اور تہذیبی ورثے سے تقریباً نا آشنا ہیں۔ ایسے وقت میں جب ہندوستان تیزی سے ایک مخصوص تہذیبی اور نظریاتی سمت میں بڑھ رہا ہے، اپنی تاریخ اور شناخت سے کٹ کر یہ نسل ہندوتوا کی تہذیبی سیاست کا مقابلہ کیسے کر پائے گی، یہ ایک سنجیدہ اور فکری سوال ہے۔ اگر اس صورتحال میں مسلمانوں کی آنے والی نسلیں اپنی تاریخ اور تہذیبی روایات سے بیگانہ رہیں تو ہندوتوادی برہمنیت، جس کا سب سے مضبوط ہتھیار کلچر کے ذریعے لوگوں کو اپنے دھارے میں شامل کرنا ہے، ان کے لیے یہ بچے آسان نشانہ بن سکتے ہیں۔ جس طرح بدھ مت، جین مت اور سکھ مت وقت کے ساتھ برہمنیت کے نرغے میں آ گئے، بعید نہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل کا ایک بڑا حصہ بھی اس کا شکار ہو جائے۔ یہ ماحول ان کے اندر احساس کمتری پیدا کرے گا۔ جب مسلم بچے اپنی تاریخ سے بیگانے ہو جائیں گے تو ان کی مثال اس جڑ کٹے پیڑ کی سی ہو جائے گی جسے ذرا سی تیز ہوا اپنے ساتھ اڑا لے جاتی ہے۔ ان تبدیلیوں کے اثرات 1857 اور 1947 کے انقلابات سے بھی زیادہ شدید ہوں گے۔ یہ تقریباً وہی حالات ہیں جن سے مولانا مودودی نے 1937 میں خبردار کیا تھا لیکن دیگر اسباب کے بدولت اس وقت مسلمان اس کو جھیل گئے تھے لیکن اب حالات اسی رخ پر جا رہے ہیں۔ مولانا مودودی نے مسلمانوں کو خبردار کرتے ہوئے لکھا تھا:

"جو لوگ خس و خاشاک کی طرح ہر رو پر بہنے کے لیے تیار ہیں، اور جن کو خدا نے اتنی سمجھ بوجھ ہی نہیں دی ہے کہ اپنے لیے زندگی کا کوئی راستہ متعین کر سکیں، ان کا ذکر تو قطعاً فضول ہے انہیں غفلت میں پڑا رہنے دیجئے زمانے کا سیلاب جس رخ پر ہے گا وہ آپ سے آپ اسی رخ پر بہہ جائیں گے۔ اسی طرح ان لوگوں سے بھی قطع نظر کیجیے جو آنے والی انقلابی قوتوں پر سمجھ بوجھ کر ایمان لاتے ہیں اور بالا رادہ اسی رخ پر جانا چاہتے ہیں جس پر زمانہ کا طوفانی دریا جا رہا ہے۔ اب صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جو مسلمان ہیں مسلمان رہنا چاہتے ہیں مسلمان مرنا چاہتے ہیں اور یہ تمنا رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب زندہ رہے اور ہماری آئندہ نسلیں محمد عربیؐ کی بتائی ہوئی راہ پر قائم رہیں۔ ان لوگوں کے لیے یہ وقت رواداری سے گزار دینے کا نہیں بلکہ گہری سوچ اور غایت درجہ کے غور و فکر کا ہے۔ وہ اگر اس نازک وقت میں غفلت اور بے پروائی سے کام لیں گے تو ایک جرم عظیم کا ارتکاب کریں گے اور اس جرم کی سزا صرف آخرت ہی میں نہیں ملے گی بلکہ اسی دنیا کی زندگی میں ان پر چھا جائے گی۔ زمانہ کا بے درد ہاتھ ان کی آنکھوں کے سامنے تہذیب اسلامی کے ایک ایک نشان کو مٹائے گا اور وہ بے بسی کے ساتھ اس کو دیکھا کریں گے۔ زمانہ ان کے قومی وجود کو ملیامیٹ کرے گا۔ ایک ایک کر کے ان امتیازی حدود کو ڈھائے گا جن سے اسلام غیر اسلام سے ممیز ہوتا ہے ہر اس خصوصیت کو فنا کر دے گا جس پر مسلمان دنیا میں فخر کرتا رہا ہے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ ان کی آنکھیں خود اپنے گھروں میں اپنی نو خیز نسلوں کو خدا پرستی سے دور، اسلامی تہذیب سے بیگانہ اور اسلامی اخلاق سے عاری دیکھیں گی اور آنسو تک نہ بہا سکیں گی۔ ان کی اپنی اولاد اس فوج کی سپاہی بن کر اٹھے گی جسے اسلام اور اس کی تہذیب کے خلاف صف آراء کیا جائے گا۔ وہ اپنے جگر گوشوں کے ہاتھ سے تیر کھائیں گے اور جواب میں کوئی تیر نہ چلا سکیں گے"

تاریخ کسی بھی قوم کی اجتماعی یادداشت کا نام ہے اور تہذیب کے اجزاء میں تاریخ کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کی تہذیبی شناخت مسلسل خطرے میں ہے وہاں اپنی تاریخ کی حفاظت صرف علمی فریضہ نہیں بلکہ تہذیبی بقا کی جنگ بھی ہے۔ فی الوقت مسلمان اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ حکومت کی کوششوں کو روک سکیں لیکن وہ اب بھی اس قابل ضرور ہیں کہ اپنی آنے والی نسلوں تک تاریخ کا درست فہم اور صحیح بیانیہ پہنچا سکیں۔

تاریخ کی سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ اقوام کو مٹانے کے لیے ہمیشہ بیرونی دشمن کی ضرورت نہیں ہوتی، اکثر اوقات زوال اندر سے جنم لیتا ہے۔ اگرچہ مسلمان جبر و استبداد کے ہاتھوں اپنی تاریخ کھونے نہیں دیں گے مگر غفلت بے حسی اور فکری کمزوری نے جڑیں پکڑ لیں تو وہ اپنی تاریخ کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیں گے۔ جیسا کہ ٹوائن بی نے کہا تھا "قومیں قتل سے نہیں خودکشی سے مرتی ہیں"—اور خودکشی ہمیشہ اندرونی سستی، فکری بے راہ روی اور تہذیبی لاشعور سے جنم لیتی ہے۔ اس تہذیبی خودکشی سے بچنے کے لیے مسلمانوں کو اپنی تاریخ کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کو اپنی تاریخ کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے خالص علمی، تربیتی اور تخلیقی ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت ہے

اس لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل کو بتایا جائے کہ وہ اس ملک کے لیے نہ کبھی بوجھ تھے اور نہ آج ہیں۔ گزشتہ چودہ سو برسوں کے دوران انہوں نے اس ملک کی تعمیر، ترقی اور تہذیبی ارتقا میں بھرپور کردار ادا کیا ہے اور آج بھی وہ اس کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔ نئی نسل کو یہ اعتماد بخشنا ضروری ہے کہ وہ اس منظم پروپیگنڈے سے مرعوب، شرمندہ یا پریشان نہ ہو بلکہ اپنے ماضی اور اپنی خدمات سے آگاہی کی بنیاد پر اعتماد کے ساتھ اس کا مقابلہ کرے۔ آئندہ صفحات میں ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں مسلمانوں کی انہی خدمات اور کارناموں کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

آخر میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو محض فخر یا ماضی پرستی کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ اسے "زندہ تاریخ" کے طور پر پیش کریں—ایسی تاریخ جو ہمیں حال کے تقاضوں سے آگاہ کرے اور مستقبل کی راہیں دکھائے۔ نئی نسل کو یہ سکھایا جائے کہ ہمارا ماضی صرف گزرے ہوئے دنوں کی کہانی نہیں بلکہ ایک زندہ روایت ہے جو ہماری شناخت کی بنیاد ہے اور جس سے سبق لے کر ہم آج کے چیلنجوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

مہاراشٹر کے دو المناک واقعات: کیا نفرت اب سماجی بحران بنتی جا رہی ہے؟

توحید خان اور کفایت علی کے سانحات: کیا ہم ایک خطرناک معمول کے عادی ہو رہے ہیں؟

”اپنا دفاع کرنا ہر شہری کا قانونی حق ہے“ ہجومی تشدد کی روک تھام کے لیے ایک پیغام

تشدد کے بڑھتے واقعات سے مسلمانوں میں بے چینی۔ کیا مسلمانوں کے لیے دائرہ تنگ ہو چکا ہے؟

ضمیر احمد خان، ناندیڑ

کسی بھی مہذب معاشرے کی اصل پہچان اس کے قانون، انصاف اور انسانی جان کے احترام سے ہوتی ہے۔ لیکن جب معمولی تنازعات، مذہبی تعصب یا نفرت انگیز ذہنیت انسانی جان لینے تک پہنچ جائیں تو یہ صرف ایک فرد یا خاندان کا المیہ نہیں رہتا بلکہ پورے معاشرے کے اخلاقی اور سماجی بحران کی علامت بن جاتا ہے۔ مہاراشٹر کے اضلاع بیڑ اور ناندیڑ میں پیش آنے والے دو افسوس ناک واقعات، جن میں توحید خان اور کفایت علی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، محض الگ الگ فوجداری مقدمات نہیں بلکہ ہمارے معاشرے میں بڑھتی ہوئی عدم برداشت، تشدد اور نفرت انگیز رجحانات کی خطرناک عکاسی کرتے ہیں۔ ان دونوں سانحات نے نہ صرف دو خاندانوں کی خوشیاں چھین لیں بلکہ یہ سوال بھی کھڑا کر دیا کہ آخر اختلاف، اشتعال اور تعصب کا انجام کب تک بے گناہ جانوں کے ضیاع کی صورت میں سامنے آتا رہے گا؟ یہ مضمون انہی واقعات کے تناظر میں معاشرتی رویوں، قانون کی عمل داری، نفرت انگیز ذہنیت اور سماجی ہم آہنگی کے تقاضوں کا جائزہ لیتا ہے تاکہ ان سانحات سے سبق حاصل کرتے ہوئے ایک پرامن، عادلانہ اور انسان دوست معاشرے کی تشکیل کی ضرورت کو اجاگر کیا جا سکے۔

بیڑ کے تعلقہ پرلی میں توحید خان کا بہیمانہ قتل

مہاراشٹر کے ضلع بیڑ کی تحصیل پرلی کی فضا ان دنوں غیر معمولی طور پر سوگوار اور بوجھل تھی۔ شہر کی سڑکوں پر اگرچہ معمول کی چہل پہل جاری تھی لیکن لوگوں کی گفتگوؤں میں ایک عجیب سی اداسی، بے چینی اور اضطراب نمایاں تھا۔ ہر زبان پر صرف ایک ہی نام تھا ”توحید خان“ ایک ایسا نوجوان جس کی زندگی اچانک نفرت، سفاکیت اور بے رحمی کی ایک دردناک داستان بن کر ختم ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ انسان کی موت صرف ایک جسم کا خاتمہ نہیں ہوتی بلکہ اس سے وابستہ کئی زندگیاں بھی بکھر جاتی ہیں۔ توحید خان کی المناک موت نے بھی ایسا ہی منظر پیدا کیا۔ تین معصوم بچے یکایک یتیمی کے سائے تلے آ گئے، ایک ضعیف والد اپنے بڑھاپے کے مضبوط سہارے سے محروم ہو گیا اور ایک گھر کی روشنیاں اچانک مدھم پڑ گئیں۔ یہ محض ایک قتل کا واقعہ نہیں تھا بلکہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے انسانیت کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اطلاعات کے مطابق توحید خان کو مالی معاملات کے بہانے پرلی شہر سے باہر ایک مقام پر بلایا گیا۔ راستے میں ایک ڈھابے پر سب نے کھانا کھایا۔ شاید اُس وقت توحید خان کو یہ احساس بھی نہ تھا کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ بیٹھا ہے، وہی چند لمحوں بعد اس کی زندگی کے آخری لمحوں کے گواہ بن جائیں گے۔ الزام ہے کہ چند ہی لمحوں بعد حالات یکسر بدل گئے۔ توحید خان پر نہایت بے رحمانہ حملہ کیا گیا۔ پہلے اسے زمین پر گرایا گیا، پھر اس کے سر ایک پتھر پر رکھ کر دوسرے بھاری پتھر سے وار کیا گیا۔ اگر یہ الزامات درست ثابت ہوتے ہیں تو یہ محض ایک قتل نہیں بلکہ انسانیت کی روح کو زخمی کرنے والا ایک دل دہلا دینے والا واقعہ ہے۔ الزام ہے کہ واردات کے بعد قاتلوں نے جرم کے شواہد مٹانے کی کوشش کی۔ لاش کو ایک کار کی ڈِکی میں رکھ کر ریلوے ٹریک کے قریب پھینک دیا گیا تاکہ واقعہ ایک حادثہ معلوم ہو اور مقتول کی شناخت بھی نہ ہو سکے۔ تاہم قدرت کو شاید کچھ اور منظور تھا۔ کتوں نے لاش کو پٹری کے درمیان کھینچ لیا، جس کے باعث متعدد ٹرینیں گزرنے کے باوجود جسم زیادہ متاثر نہ ہوا اور بالآخر یہ واقعہ منظر عام پر آ گیا۔ ادھر دو روز تک گھر واپس نہ آنے پر اہل خانہ شدید اضطراب میں مبتلا رہے۔ گھر کے تمام افراد بے چینی سے اس کی واپسی کے منتظر تھے۔ بعد ازاں پولیس کی اطلاع پر جب اہل خانہ نے پوسٹ مارٹم ہاؤس میں کپڑوں کی مدد سے لاش کی شناخت کی تو ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جس شخص کی واپسی کی امید تھی، وہ سرد لاش کی صورت میں ان کے سامنے تھا۔ اس سانحے نے اس وقت مزید سنگین رخ اختیار کر لیا جب مبینہ طور پر سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو سامنے آئی جس میں قتل پر خوشی اور اشتعال انگیز خیالات کا اظہار کیا گیا۔ اگر یہ ویڈیو مستند ثابت ہوتی ہے تو یہ صرف ایک فرد کی ذہنیت نہیں بلکہ معاشرے میں پنپتی ہوئی خطرناک انتہا پسندانہ سوچ کی عکاسی کرتی ہے، جو مذہبی شناخت اور تعصب کی بنیاد پر انسانوں کو تقسیم کرتی ہے اور تشدد کو جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ پولیس نے وائرل ویڈیو اور کال ریکارڈ کی بنیاد پر دو لوگوں کو گرفتار کر لیا ہے، جبکہ مزید تفتیش جاری ہے۔ دوسری جانب اہل خانہ کا کہنا ہے کہ اس واردات میں مزید افراد بھی ملوث ہو سکتے ہیں، جنہیں قانون کے کٹہرے میں لانا ضروری ہے۔ اس غم کے ماحول میں امید کی ایک کرن بھی دکھائی دی۔ پرلی کے ہندو، مسلم اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے شہری، سماجی کارکنان اور آئین و انسانیت پر یقین رکھنے والے افراد متاثرہ خاندان کے ساتھ کھڑے نظر آئے۔ یہ منظر اس امید کی علامت تھا کہ معاشرے میں انسانیت کی قدریں ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئیں۔

ناندیڑ کے سونکھیڑ میں کفایت علی کی دردناک موت

اسی نوعیت کا ایک دوسرا واقعہ مہاراشٹر کے ضلع ناندیڑ کے سونکھیڑ گاؤں میں پیش آیا۔ 10 جون 2026 کی شام سونکھیڑ میں ہر چیز معمول کے مطابق دکھائی دے رہی تھی۔ سورج کی تپش مدھم پڑ چکی تھی اور پٹرول پمپ کے احاطے میں چند مزدور اپنی روزمرہ کی محنت میں مصروف تھے۔ کوئی نل فٹنگ کے اوزار سنبھالے ہوئے تھا، کوئی پائپ جوڑ رہا تھا اور کوئی خاموشی سے پسینہ پونچھ کر دوبارہ اپنے کام میں لگ جاتا تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ روزی روٹی کی تلاش میں گزرنے والا یہ معمول کا دن چند لمحوں بعد ایک المناک سانحے میں بدل جائے گا۔ انہی محنت کشوں میں شہر ناندیڑ کے پیر برہان نگر کا رہائشی کفایت علی بھی شامل تھا۔ وہ اپنے بھائی اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ سونکھیڑ کے مورگے پٹرول پمپ پر نل فٹنگ کا کام کر رہا تھا۔ شام تقریباً چار بجے دو نامعلوم افراد موٹر سائیکل پر وہاں پہنچے اور پٹرول کی دستیابی کے بارے میں دریافت کیا۔ چونکہ اس وقت پمپ کا عملہ موجود نہیں تھا، اس لیے کفایت علی اور اس کے بھائی نے لاعلمی ظاہر کی۔ یہ ایک معمولی سا جواب تھا لیکن بعض اوقات معمولی باتیں بھی چھپی ہوئی تلخیوں کو بھڑکا دیتی ہیں۔ بحث شروع ہوئی، لہجے سخت ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بات ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ الزام ہے کہ دونوں نے کفایت علی اور اس کے بھائی پر حملہ کر دیا۔ چند لمحے پہلے تک جہاں مزدوروں کے اوزاروں کی آوازیں گونج رہی تھیں، وہاں اچانک چیخ و پکار اور بھگدڑ مچ گئی۔ الزام ہے کہ حملہ آور نے لوہے کی سلاخ سے کفایت علی پر وار کیا، جس کے نتیجے میں وہ شدید زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا۔ ساتھیوں نے فوری طور پر اسے ناندیڑ کے سرکاری ہسپتال منتقل کیا، مگر تمام کوششوں کے باوجود وہ دورانِ علاج زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گیا۔ ایک نوجوان کی موت صرف ایک فرد کی موت نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ کئی خواب، کئی امیدیں اور کئی رشتے بھی دم توڑ دیتے ہیں۔ کفایت علی کی موت کی خبر جیسے ہی پیر برہان پہنچی، پورا علاقہ سوگ میں ڈوب گیا۔ وہ نہ صرف اپنی بیوی اور بچوں بلکہ اپنے ضعیف والدین کی کفالت بھی کرتا تھا۔ اس کی اچانک موت نے پورے خاندان کو شدید معاشی اور ذہنی بحران سے دوچار کر دیا۔ غم و اندوہ کے اظہار کے طور پر پیر برہان کے تاجروں نے اپنی تمام دکانیں بند رکھیں۔ اگلی صبح جب کفایت علی کا جنازہ اس کے گھر سے اٹھا تو گلیاں سوگواروں سے بھر گئیں۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر زبان پر دعائے مغفرت تھی اور ہر دل میں ایک ہی سوال تھا کہ آخر ایک معمولی تنازع اتنے ہولناک انجام تک کیوں پہنچ جاتا ہے؟ کیا معمولی تلخ کلامی بھی کسی انسان کی جان لینے کا سبب بن سکتی ہے؟ پولیس نے فوری کارروائی کرتے ہوئے دونوں قاتلوں پون چودھری اور بالاجی مورے کو گرفتار کر لیا۔ بتایا جاتا ہے کہ پٹرول پمپ پر نصب سی سی ٹی وی کیمروں میں پوری واردات ریکارڈ ہو گئی ہے۔ مقدمہ درج کر لیا گیا ہے اور مزید تفتیش جاری ہے۔

ہجومی تشدد کے بڑھتے واقعات لمحہ فکریہ

پرلی میں توحید خان کا قتل ہو یا سونکھیڑ میں کفایت علی پر ہونے والا جان لیوا حملہ، دونوں واقعات کے پس منظر، انداز اور اثرات میں ایک مشترک درد نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ دونوں نوجوان محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے تھے، دونوں اپنے اپنے خاندانوں کا سہارا تھے، اور دونوں کی المناک موت نے صرف ان کے اہلِ خانہ ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے کو اضطراب اور بے چینی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان دونوں سانحات کا سب سے زیادہ تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ تشدد اب محض وقتی غصے کا ردِعمل نہیں رہا بلکہ بعض ذہنوں میں ایک منظم، خطرناک اور انتہا پسندانہ سوچ کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اگر اختلافِ رائے، معمولی تنازع یا مذہبی شناخت کسی انسان کی جان لینے کا جواز بننے لگے تو یہ صرف امن و امان کا مسئلہ نہیں بلکہ معاشرے کے اخلاقی زوال کی بھی علامت ہے۔ توحید خان کے قتل کے بعد مبینہ طور پر سوشل میڈیا پر سامنے آنے والی نفرت انگیز بیان بازی اور قتل پر فخر کا اظہار اسی خطرناک ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ جب کوئی شخص ایک سنگین جرم کو کامیابی یا اطمینان کا ذریعہ سمجھنے لگے تو یہ محض قانون کے نفاذ کی کمزوری نہیں بلکہ معاشرتی، اخلاقی اور فکری بحران کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ اسی طرح کفایت علی کے معاملے میں معمولی تلخ کلامی کا جان لیوا تشدد میں تبدیل ہو جانا اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ برداشت، تحمل اور مکالمے کی روایت بتدریج کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ گزشتہ چند برسوں میں نفرت آمیز تقاریر، مذہبی منافرت، سوشل میڈیا پر اشتعال انگیز مواد اور سیاسی تقسیم نے معاشرے کے ماحول کو مزید کشیدہ بنایا ہے۔ جب سیاست سماج کو تقسیم کرنے کا ذریعہ بن جائے، ٹیلی ویژن کے مباحثے شائستہ مکالمے کے بجائے اشتعال انگیزی کو فروغ دیں اور نوجوانوں کی ذہن سازی مثبت اقدار کے بجائے نفرت پر مبنی مواد سے ہونے لگے تو ایسے افسوس ناک واقعات جنم لیتے ہیں۔ نفرت اچانک پیدا نہیں ہوتی بلکہ اسے مسلسل پروان چڑھایا جاتا ہے۔ ان واقعات کی روک تھام کے لیے صرف پولیس کارروائی یا سخت سزائیں کافی نہیں ہوں گی، اگرچہ قانون کا فوری، مؤثر اور غیر جانبدارانہ نفاذ بے حد ضروری ہے۔ اصل ضرورت ایک جامع اور ہمہ جہت حکمتِ عملی کی ہے، جس میں حکومت، عدلیہ، تعلیمی ادارے، مذہبی قائدین، ذرائع ابلاغ، سماجی تنظیمیں اور عام شہری سب اپنا مثبت کردار ادا کریں۔ سب سے پہلے نفرت انگیز تقاریر، فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی اور تشدد پر اکسانے والے عناصر کے خلاف بلاامتیاز اور سخت قانونی کارروائی ضروری ہے۔ قانون کی عملداری اس انداز میں ہونی چاہیے کہ کسی بھی شہری کو یہ احساس نہ ہو کہ انصاف مذہب، ذات، زبان یا سیاسی وابستگی کی بنیاد پر بدل جاتا ہے، کیونکہ قانون کے غیر مساوی نفاذ سے معاشرے میں بے اعتمادی جنم لیتی ہے۔ دوسرا اہم پہلو تعلیم اور اخلاقی تربیت ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں ایسی سرگرمیوں اور نصاب کو فروغ دیا جانا چاہیے جو نوجوان نسل میں برداشت، تنوع کے احترام، اختلافِ رائے کے آداب، آئینی اقدار اور انسانی مساوات کا شعور پیدا کرے۔ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا کسی معاشرے کو مہذب نہیں بناتا بلکہ مضبوط اخلاقی تربیت ہی پائیدار سماجی استحکام کی بنیاد بنتی ہے۔ اسی طرح سوشل میڈیا پر مؤثر نگرانی بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ آج یہ پلیٹ فارم مثبت ابلاغ کے ساتھ ساتھ نفرت، افواہوں اور اشتعال انگیز مواد کے فروغ کا ذریعہ بھی بن چکا ہے۔ اس لیے متعلقہ اداروں کو آزادیِ اظہار اور نفرت انگیز اظہار کے درمیان واضح فرق قائم کرتے ہوئے قانون کے مطابق کارروائی کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ مختلف مذاہب، برادریوں اور طبقات کے درمیان مکالمے، باہمی اعتماد اور سماجی ہم آہنگی کو فروغ دینا بھی ناگزیر ہے۔ جب لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور مشترکہ مسائل کے حل کے لیے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں تو نفرت کی دیواریں کمزور پڑنے لگتی ہیں۔ پرلی میں توحید خان کے لواحقین کے ساتھ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کی یکجہتی اسی امید کی علامت ہے کہ انسانیت کی روشنی ابھی پوری طرح بجھی نہیں۔ ذرائع ابلاغ کا کردار بھی اس حوالے سے نہایت اہم ہے۔ اگر صحافت صرف ریٹنگ، سنسنی خیزی اور سیاسی مفادات تک محدود ہو جائے تو معاشرے میں تقسیم اور بداعتمادی مزید گہری ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس ذمہ دار صحافت امن، انصاف، سماجی ہم آہنگی اور آئینی اقدار کو فروغ دینے میں مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے۔ توحید خان اور کفایت علی کے سانحات ہمیں ایک واضح پیغام دیتے ہیں کہ اگر نفرت، عدم برداشت اور تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحانات کا بروقت اور سنجیدگی سے تدارک نہ کیا گیا تو مستقبل میں ایسے واقعات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ کسی ایک مذہب، برادری یا طبقے کے خلاف ہونے والا ظلم درحقیقت پورے معاشرے کو کمزور کرتا ہے، کیونکہ ایک بے گناہ انسان کا قتل صرف ایک فرد کی جان لینا نہیں بلکہ آئین، قانون، انصاف اور انسانیت کے بنیادی اصولوں پر حملہ ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سیاسی اور سماجی اختلافات سے بالاتر ہو کر ایسا معاشرہ تشکیل دیں جہاں اختلافِ رائے تشدد کا سبب نہ بنے، مذہب نفرت کے بجائے اخلاق، رواداری اور انسان دوستی کا پیغام دے، اور ہر شہری اپنی جان، عزت اور بنیادی حقوق کے تحفظ کا یقین محسوس کر سکے۔ یہی ایک پرامن، مضبوط اور مہذب معاشرے کی حقیقی بنیاد ہے۔

ہجومی تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات یا پھر بڑھتی ہوئی نفرت کے سبب بے گناہ مسلم نوجوانوں پر ہونے والے جان لیوا حملوں کی وارداتوں کی روک تھام کے لیے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نیشنل سیکریٹری مولانا عمرین محفوظ رحمانی نے چند روز قبل ممبئی میں منعقدہ ایک اہم اجلاس کے دوران اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے دو اہم مشورے دیے تھے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اسلام نے رواداری، مروت، رحمت ضرور سکھاتا ہے۔ دوسروں کی مصیبت کی گھڑی میں ہم ان کے ساتھ کھڑے رہیں اور ایک دوسرے کے کام آئیں، یہ اسلام کی تعلیم ہے، لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام نے لکیریں بھی کھینچ دی ہیں۔ ان لکیروں سے آگے بڑھنے کا حق کسی کو نہیں ہے اور اگر اس سلسلے میں ہم نے نرمی برتی تو یاد رکھیے، لوگ ہمیں بیس سال کے بعد جہاں پہنچانا چاہتے ہیں، ہم وہاں خود اپنے عمل کے ذریعے دو سال میں پہنچ جائیں گے۔ ماب لنچنگ کے سلسلے میں ہم گزارش تو ضرور کر رہے ہیں کہ اس پر قانون بنایا جائے۔ قانون ہے بھی، لیکن اس پر کتنا عمل ہو رہا ہے، اس پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ صرف مطالبہ کرنے سے یا قانون کی بات کہنے سے ماب لنچنگ نہیں رکے گی۔ یا پھر اجلاس منعقد کر کے صرف مذمتی قرارداد منظور کرنے سے ماب لنچنگ کا سلسلہ نہیں رکے گا۔ ہمیں بہت وضاحت کے ساتھ اور قانون کے حوالے کے ساتھ ساری ملی جماعتوں، تنظیموں، سیاسی اور مذہبی قائدین کی طرف سے یہ

بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر 14

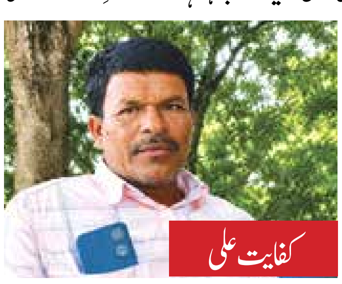

پرلی میں توحید خان کا قتل ہو یا سونکھیڑ میں کفایت علی پر ہونے والا جان لیوا حملہ، دونوں واقعات کے پس منظر، انداز اور اثرات میں ایک مشترک درد نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ دونوں نوجوان محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے تھے، دونوں اپنے اپنے خاندانوں کا سہارا تھے، اور دونوں کی المناک موت نے صرف ان کے اہلِ خانہ ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے کو اضطراب اور بے چینی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان دونوں سانحات کا سب سے زیادہ تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ تشدد اب محض وقتی غصے کا ردِعمل نہیں رہا بلکہ بعض ذہنوں میں ایک منظم، خطرناک اور انتہا پسندانہ سوچ کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اگر اختلافِ رائے، معمولی تنازع یا مذہبی شناخت کسی انسان کی جان لینے کا جواز بننے لگے تو یہ صرف امن و امان کا مسئلہ نہیں بلکہ معاشرے کے اخلاقی زوال کی بھی علامت ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

نوجوان علم، مہارت اور کردار کی نئی دنیا تعمیر کریں

حالات کا شکوہ نہیں، صلاحیت، محنت اور مسلسل جدوجہد ہی آنے والے دور میں کامیابی کا راستہ ہے

ڈاکٹر احمد عروج مدثر، اکولہ

انسانی تاریخ میں بعض ادوار ایسے آتے ہیں جب وقت کی رفتار غیر معمولی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ وہ ادوار ہوتے ہیں جب تبدیلی محض حالات تک محدود نہیں رہتی بلکہ انسانوں کا طرزِ فکر، معاشروں کی ساخت، معیشت کے اصول، سیاست کی سمت اور کامیابی کے پیمانے تک تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جو قومیں ان تبدیلیوں کو بروقت سمجھ لیتی ہیں وہ ترقی کی نئی منزلیں طے کرتی ہیں، جبکہ جو ماضی کے سہارے حال کو گزارنے کی کوشش کرتی ہیں، وہ آہستہ آہستہ تاریخ کے حاشیے پر چلی جاتی ہیں۔ اکیسویں صدی کا موجودہ دور بھی اسی نوعیت کا ہے۔ مصنوعی ذہانت، ڈیجیٹل معیشت، عالمی مسابقت، تیز رفتار مواصلات اور بدلتے ہوئے سماجی رویے دنیا کو ایک نئے مرحلے میں داخل کر رہے ہیں۔ اس ماحول میں سب سے اہم سوال یہ نہیں کہ دنیا کتنی بدل رہی ہے، بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنی شخصیت، اپنی صلاحیت اور اپنے کردار کو اس تبدیلی کے لیے کس حد تک تیار کر رہے ہیں۔

یہ سوال ہر فرد کے لیے اہم ہے لیکن نوجوان نسل کے لیے اس کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ نوجوانی زندگی کا وہ دور ہے جب خواب حقیقت کا روپ دھار سکتے ہیں، صلاحیتیں نکھر سکتی ہیں اور مستقبل کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ یہی وہ عمر ہے جس میں انسان اپنے لیے راستہ بھی منتخب کرتا ہے اور اپنی شناخت بھی تشکیل دیتا ہے۔ اگر یہی دور بے مقصدیت، غفلت اور شکایت میں گزر جائے تو بہترین صلاحیتیں بھی ضائع ہو جاتی ہیں، لیکن اگر یہی وقت علم، محنت اور خود سازی میں صرف ہو تو محدود وسائل رکھنے والا انسان بھی غیر معمولی کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے مسائل کا تجزیہ کرنے سے زیادہ ان کا شکوہ کرنے میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔ گفتگو میں تعلیمی نظام کی کمزوریاں، بے روزگاری، سیاسی انتشار، معاشی دشواریاں اور سماجی ناانصافیاں تو نمایاں رہتی ہیں مگر اس سوال پر کم غور کیا جاتا ہے کہ ان حالات میں اپنی ذمہ داری کیا بنتی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ معاشرے میں بہت سی مشکلات موجود ہیں لیکن تاریخ اس بات کی بھی گواہ ہے کہ کسی بھی قوم نے صرف شکایتوں کے سہارے ترقی نہیں کی۔ ترقی ان لوگوں کا مقدر بنی جنہوں نے حالات کو اپنی تقدیر نہیں بلکہ اپنے عزم کا امتحان سمجھا۔

قرآن مجید انسان کو ابتدا ہی سے اس حقیقت کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتا ہے کہ دنیا امتحان کی جگہ ہے، آرام گاہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ" یعنی ہم تمہیں خوف، بھوک، مال و جان اور پیداوار کے نقصان سے ضرور آزمائیں گے، اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دو۔ اس آیت میں زندگی کا ایک بنیادی اصول بیان کر دیا گیا ہے کہ آزمائش غیر معمولی چیز نہیں بلکہ زندگی کی فطرت ہے۔ اصل سوال یہ نہیں کہ مشکلات کیوں ہیں بلکہ یہ ہے کہ ان مشکلات کے مقابلے میں ہمارا رویہ کیا ہے۔ جو انسان ہر رکاوٹ کو اپنی ناکامی کا جواز بنا لیتا ہے، وہ اپنی قوتِ ارادی کھو دیتا ہے، جبکہ جو انہی مشکلات کو اپنی تربیت کا ذریعہ بنا لیتا ہے، وہ شخصیت کی نئی بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے۔

آج دنیا کے سامنے نئے چیلنجز ضرور ہیں، مگر نئے مواقع بھی پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ علم کی دنیا چند اداروں تک محدود نہیں رہی، پوری دنیا ایک کھلی درسگاہ بن چکی ہے۔ ٹیکنالوجی نے سیکھنے، تحقیق کرنے، کاروبار شروع کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے بے شمار راستے کھول دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والا زمانہ صرف ڈگری رکھنے والوں کا نہیں بلکہ مہارت رکھنے والوں کا ہوگا۔ دنیا اب اس شخص کو اہمیت دیتی ہے جو مسائل کا حل پیش کر سکے، نئی چیزیں سیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو، بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کر سکے اور مسلسل اپنی فکری و عملی استعداد میں اضافہ کرتا رہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ نوجوان اپنی زندگی کا مرکز دوسروں کے حالات کے بجائے اپنی ذات کو بنائے۔ اکثر لوگ اپنی توانائی اس بات پر صرف کرتے ہیں کہ معاشرہ ان کے لیے کیا کر رہا ہے، جبکہ زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ وہ خود اپنی صلاحیتوں کی تعمیر کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ زندگی میں حقیقی تبدیلی ہمیشہ اندر سے شروع ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اعلان کرتا ہے: "إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ"۔۔۔ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت بدلنے کی کوشش نہ کرے۔

قرآن کریم نے فرد اور معاشرے دونوں کے لیے ایک دائمی اصول بیان کیا ہے۔ قوموں کی تقدیر اربابِ اقتدار کے قلم سے لکھے جانے سے پہلے افراد کے ذہنوں میں لکھی جاتی ہے۔ ہر بڑی تبدیلی کا آغاز ایک فرد کے اندر پیدا ہونے والے احساسِ ذمہ داری سے ہوتا ہے۔ جب انسان اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہے، اپنی صلاحیتوں کو نکھارتا ہے اور مسلسل سیکھنے کا عزم کرتا ہے، تبھی اس کی زندگی کا رخ بدلتا ہے۔ علامہ اقبال کا پیغام غیر معمولی معنویت اختیار کر لیتا ہے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

اقبال کا یہ مصرع صرف شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ ایک مکمل فلسفۂ حیات ہے۔ وہ نوجوان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ دوسروں کی زندگیوں میں کھو جانے کے بجائے اپنے باطن میں اترے، اپنی حقیقت کو پہچانے اور ان صلاحیتوں کو دریافت کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ودیعت کی ہیں۔ انسان کی سب سے بڑی محرومی وسائل کی کمی نہیں بلکہ اپنی اصل استعداد سے ناواقفیت ہے۔ بے شمار لوگ زندگی بھر دوسروں کی تقلید کرتے رہتے ہیں، مگر کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ ان کی اپنی انفرادیت کیا ہے اور وہ کس میدان میں غیر معمولی کارکردگی دکھا سکتے ہیں۔ اقبال ہی نے کہا تھا:

عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تری
بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا

یہ شعر نوجوان کے اندر امید، اعتماد اور خود شناسی کی روح پیدا کرتا ہے۔ دنیا امکانات سے بھری ہوئی ہے، مگر ان امکانات تک وہی پہنچتا ہے جو اپنی نگاہ بدل لیتا ہے۔ حالات سے شکوہ کرنے والی نگاہ ہر طرف رکاوٹیں دیکھتی ہے، جبکہ خود اعتمادی سے بھرپور نگاہ انہی حالات میں نئے راستے تلاش کر لیتی ہے۔

جدید نفسیات بھی اسی حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ ماہرِ نفسیات ابراہام میسلو نے انسانی شخصیت کی بلند ترین منزل کو Self-Actualization کا نام دیا، یعنی اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لانا۔ ان کے مطابق ہر انسان کے اندر کچھ ایسی استعداد موجود ہوتی ہے جو اس کی انفرادی پہچان بنتی ہے، مگر بہت سے لوگ اپنی پوری زندگی اس خزانے کو دریافت کیے بغیر گزار دیتے ہیں۔ اسی طرح کیرول ڈویک کی تحقیق بتاتی ہے کہ کامیاب افراد اپنی صلاحیتوں کو جامد نہیں سمجھتے بلکہ مسلسل ترقی پذیر مانتے ہیں۔ وہ ناکامی کو انجام نہیں بلکہ سیکھنے کا ایک مرحلہ تصور کرتے ہیں۔ یہی GrowthMindset دراصل ترقی کی بنیاد بنتا ہے۔

بدقسمتی سے آج کا نوجوان ایک اور نفسیاتی مسئلے کا شکار ہے۔ سوشل میڈیا نے دوسروں کی کامیابیوں کو ہماری نظروں کے سامنے لا کھڑا کیا ہے، مگر ان کامیابیوں کے پس پردہ برسوں کی محنت، ناکامیاں اور قربانیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ نتیجتاً بہت سے نوجوان اپنی زندگی کا موازنہ دوسروں کی ظاہری کامیابیوں سے کرنے لگتے ہیں اور احساسِ محرومی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ نفسیات میں اسے ComparisonTrap کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا جال ہے جس میں پھنس کر انسان اپنی راہ بھول جاتا ہے۔ وہ اپنی رفتار سے سفر کرنے کے بجائے دوسروں کی منزلوں کو دیکھ کر مایوس ہونے لگتا ہے، حالانکہ ہر انسان کا سفر، صلاحیت اور حالات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

قرآن مجید انسان کو بار بار اپنی ذات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے: "وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ"

یعنی تمہارے اپنے وجود میں بھی اللہ کی نشانیاں ہیں، کیا تم انہیں نہیں دیکھتے؟

جب انسان اپنے اندر جھانکتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ اس کے اندر صلاحیت بھی رکھی ہے، ذمہ داری بھی اور زندگی کا ایک مقصد بھی۔ یہی احساس انسان کو مایوسی سے نکال کر عمل کی طرف لے جاتا ہے اور اسی مقام سے شخصیت کی حقیقی تعمیر کا سفر شروع ہوتا ہے۔

شخصیت کی تعمیر کا سفر صرف اپنی صلاحیتوں کو پہچان لینے سے مکمل نہیں ہوتا بلکہ ان صلاحیتوں کو مسلسل نکھارنے سے آگے بڑھتا ہے۔ دنیا میں وہی افراد اپنی پہچان قائم کر پاتے ہیں جو سیکھنے کے عمل کو کبھی ختم نہیں ہونے دیتے۔ ایک زمانہ تھا جب ایک ڈگری پوری زندگی کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی، مگر آج صورتِ حال یکسر مختلف ہے۔ علم کی رفتار اتنی تیز ہو چکی ہے کہ جو شخص سیکھنا چھوڑ دیتا ہے، وہ رفتہ رفتہ اپنے زمانے سے کٹ جاتا ہے۔ اسی لیے موجودہ دور کو بجا طور پر "علم اور مہارت کا دور" کہا جا سکتا ہے۔ اب کامیابی کا انحصار اس بات پر نہیں کہ آپ نے کیا پڑھا تھا، بلکہ اس پر ہے کہ آپ آج کیا سیکھ رہے ہیں اور کل کیا سیکھنے کے لیے تیار ہیں۔

مصنوعی ذہانت، ڈیجیٹل ٹیکنالوجی اور عالمی معیشت نے روزگار اور معاشرت کی پوری ساخت کو تبدیل کر دیا ہے۔ بہت سے روایتی پیشے اپنی سابقہ صورت کھو رہے ہیں اور ان کی جگہ نئی مہارتیں اہمیت اختیار کر رہی ہیں۔ تحقیق، تجزیہ، تخلیقی فکر، ابلاغ، زبان دانی، نفسیات، ڈیٹا اینالیسس، تعلیم، قیادت اور ٹیکنالوجی سے متعلق صلاحیتیں آئندہ برسوں میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہوں گی۔ اس بدلتی ہوئی دنیا میں وہی نوجوان کامیاب ہوگا جو تبدیلی سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اسے سیکھنے اور آگے بڑھنے کا موقع سمجھے گا۔

یہ حقیقت بھی قابلِ توجہ ہے کہ آج معلومات حاصل کرنا پہلے سے کہیں زیادہ آسان ہو گیا ہے، مگر بصیرت حاصل کرنا پہلے سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے معلومات کے بے شمار دروازے کھول دیے ہیں، لیکن ہر معلومات علم نہیں ہوتی اور ہر علم حکمت میں تبدیل نہیں ہوتا۔ نوجوان کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف معلومات جمع کرنے کے بجائے تنقیدی سوچ، صحیح تجزیے اور گہرے مطالعے کی عادت پیدا کرے۔ یہی عادت اسے بھیڑ سے ممتاز کرے گی اور یہی اس کی شخصیت کو فکری پختگی عطا کرے گی۔

مطالعہ اس سفر کی بنیادی ضرورت ہے۔ کتابیں صرف معلومات فراہم نہیں کرتیں بلکہ انسان کے زاویۂ نظر کو وسیع کرتی ہیں، اس کے اندر سوال پیدا کرتی ہیں اور اسے مختلف تہذیبوں، افکار اور تجربات سے روشناس کراتی ہیں۔ جو نوجوان روزانہ مطالعہ کرتا ہے، وہ دراصل صدیوں کے انسانی تجربات سے استفادہ کرتا ہے۔ اسی طرح لکھنے کی عادت بھی غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ تحریر انسان کے منتشر خیالات کو ترتیب دیتی ہے، اس کی استدلالی قوت کو مضبوط کرتی ہے اور اس کے اندر تخلیقی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ پڑھنے اور لکھنے کا باہمی تعلق شخصیت سازی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لیے سانس لینا۔

آنے والے دور میں زبانوں پر عبور بھی ایک بڑی قوت ثابت ہوگا۔ زبان محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ علم تک رسائی کا وسیلہ ہے۔ جو شخص مختلف زبانیں جانتا ہے، اس کے لیے دنیا کی علمی میراث کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اردو انسان کو اپنی تہذیبی شناخت سے جوڑتی ہے، ہندی معاشرتی روابط کو مضبوط بناتی ہے، انگریزی عالمی علمی سرمایہ تک رسائی دیتی ہے، جبکہ علاقائی زبانیں معاشرے سے گہرا تعلق قائم کرتی ہیں۔ زبانوں کی یہ ہم آہنگی شخصیت کو وسعت عطا کرتی ہے اور ابلاغ کی صلاحیت کو نکھارتی ہے۔

ذہنی نشوونما کے ساتھ جسمانی صحت بھی شخصیت کی تعمیر کا بنیادی ستون ہے۔ کمزور جسم، منتشر ذہن اور بے ترتیب طرزِ زندگی کے ساتھ بڑے مقاصد حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ اسلام نے عبادت کے ساتھ صحت، صفائی، اعتدال اور قوت کو بھی اہمیت دی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ طاقت ور مومن اللہ کے نزدیک کمزور مومن سے زیادہ محبوب ہے، اگرچہ دونوں میں خیر ہے۔ اس ارشاد میں یہ پیغام پوشیدہ ہے کہ جسمانی قوت بھی اللہ کی نعمت ہے، جسے علم، خدمت اور خیر کے کاموں میں استعمال کیا جانا چاہیے۔ مناسب نیند، متوازن غذا، باقاعدہ ورزش اور نظمِ زندگی انسان کی ذہنی کارکردگی کو بھی بہتر بناتے ہیں۔

آج کے نوجوان کے سامنے ایک اور بڑا چیلنج وقت کے ضیاع کا کلچر ہے۔ سوشل میڈیا اپنی اصل میں ایک مفید ذریعہ ہے، مگر جب وہ مقصد کے بجائے محض تفریح، موازنہ اور وقت گزاری کا ذریعہ بن جائے تو آہستہ آہستہ انسان کی توجہ، یکسوئی اور تخلیقی صلاحیت کو کمزور کر دیتا ہے۔ نوجوان کو یہ سوال روزانہ خود سے پوچھنا چاہیے کہ اس نے موبائل پر جتنا وقت گزارا، اس میں سے کتنا حصہ اس کی علمی، اخلاقی یا پیشہ ورانہ ترقی کا سبب بنا؟ اگر اس سوال کا جواب اطمینان بخش نہیں تو انہیں اپنے معمولات پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

اسلام نے وقت کی اہمیت کو غیر معمولی انداز میں واضح کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو: جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، صحت کو بیماری سے پہلے، فراغت کو مصروفیت سے پہلے، مالداری کو محتاجی سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے۔"

یہ حدیث نوجوانی کے پورے فلسفے کو چند الفاظ میں بیان کر دیتی ہے۔ جوانی دراصل زندگی کا وہ موسم ہے جس میں بویا گیا بیج آنے والی پوری زندگی کا پھل بنتا ہے۔ جو نوجوان اس زمانے کو سیکھنے، کردار سازی اور صلاحیتوں کی تعمیر میں صرف کرتا ہے، وہ مستقبل میں مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہوتا ہے، جبکہ جو اسے غفلت میں گزار دیتا ہے، وہ بعد میں حسرتوں کا شکار رہتا ہے۔

اسلامی تاریخ بھی نوجوانوں کی قوتِ کردار کی روشن مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نوجوانی میں توحید کا علم بلند کیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اقتدار سے پہلے کردار کی حفاظت کو ترجیح دی۔ اصحابِ کہف نے ایمان کی خاطر اپنے آرام کو قربان کیا، اور اصحاب رسول نے جوانی ہی میں اسلام کی دعوت اور اقامتِ دین کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ ان عظیم شخصیات میں ایک قدر مشترک تھی: واضح مقصد، مضبوط ایمان، مسلسل جدوجہد اور استقامت۔ یہی اوصاف ہر دور میں کامیابی کی بنیاد رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔

آج مسلم نوجوانوں کی ذمہ داری صرف اپنی ذاتی ترقی تک محدود نہیں ہونی چاہیے۔ انہیں اپنے معاشرے، اپنی ملت اور اپنے ملک کی ترقی میں بھی مؤثر کردار ادا کرنا ہوگا۔ تعلیم، تحقیق، معیشت، میڈیا، سماجی خدمت، سائنسی تحقیق، ٹیکنالوجی اور اخلاقی قیادت ایسے میدان ہیں جہاں ان کی موجودگی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ معاشرے کی تعمیر صرف تنقید سے نہیں بلکہ مثبت کردار، علمی برتری اور عملی خدمت سے ہوتی ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہر نوجوان اپنی زندگی کا واضح منصوبہ بنائے۔ وہ روزانہ مطالعہ کرے، کچھ نیا سیکھے، جسمانی صحت کا خیال رکھے، اپنے وقت کی حفاظت کرے، اچھی صحبت اختیار کرے، اپنی کمزوریوں کا مسلسل جائزہ لے اور اپنے رب سے تعلق مضبوط کرے۔ یہی وہ چھوٹی چھوٹی عادتیں ہیں جو وقت کے ساتھ مل کر ایک عظیم شخصیت کی بنیاد بنتی ہیں۔

آج کا دور ہمیں ایک واضح پیغام دے رہا ہے کہ مستقبل کی قیادت و امامت ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی جو اپنی تقدیر دوسروں کے فیصلوں پر نہیں چھوڑتے بلکہ اپنے کردار، علم، مہارت اور مسلسل محنت سے خود اپنا راستہ بناتے ہیں۔ حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے، لیکن باہمت انسان ہر حال میں اپنے لیے راستہ نکال لیتا ہے۔ یہی اقبال کی خودی کا پیغام ہے، یہی قرآن کا تصورِ تبدیلی ہے اور یہی جدید نفسیات کا خلاصہ بھی کہ انسان اپنی اندرونی قوتوں کو بیدار کر کے اپنی زندگی کا رخ بدل سکتا ہے۔

چنانچہ آج کے نوجوان کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ شکایتوں کی فہرست کا حصہ بنے گا یا تعمیرِ مستقبل کی داستان کا؟ اگر وہ اپنے اندر جھانک کر اپنی صلاحیتوں کو پہچان لے، علم کو اپنا سرمایہ، محنت کو اپنا شعار، استقامت کو اپنا اوڑھنا بچھونا اور اللہ پر توکل کو اپنی قوت بنا لے، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے لیے، اپنی ملت کے لیے اور اپنے ملک کے لیے ایک روشن اور باوقار مستقبل کی بنیاد نہ رکھ سکے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی۔۔۔ یہ صرف ایک شعری مصرع نہیں، بلکہ ہر اس نوجوان کے لیے دعوتِ عمل ہے جو حالات کا اسیر بننے کے بجائے اپنے کردار، اپنی صلاحیت اور اپنی مسلسل جدوجہد سے تاریخ کا دھارا موڑنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

شخصیت کی تعمیر کا سفر صرف اپنی صلاحیتوں کو پہچان لینے سے مکمل نہیں ہوتا بلکہ ان صلاحیتوں کو مسلسل نکھارنے سے آگے بڑھتا ہے۔ دنیا میں وہی افراد اپنی پہچان قائم کر پاتے ہیں جو سیکھنے کے عمل کو کبھی ختم نہیں ہونے دیتے۔ ایک زمانہ تھا جب ایک ڈگری پوری زندگی کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی، مگر آج صورتِ حال یکسر مختلف ہے۔ علم کی رفتار اتنی تیز ہو چکی ہے کہ جو شخص سیکھنا چھوڑ دیتا ہے، وہ رفتہ رفتہ اپنے زمانے سے کٹ جاتا ہے۔ اسی لیے موجودہ دور کو بجا طور پر "علم اور مہارت کا دور" کہا جا سکتا ہے۔ اب کامیابی کا انحصار اس بات پر نہیں کہ آپ نے کیا پڑھا تھا، بلکہ اس پر ہے کہ آپ آج کیا سیکھ رہے ہیں اور کل کیا سیکھنے کے لیے تیار ہیں۔

दावत ہفت روزہ
دعوت نئی دہلی
DAWAT, NEW DELHI
www.dawatnews.net

05/جولائی
تا 11/جولائی
2026

مساجد کی مسماری اور مذہبی آزادی، قانونی جدوجہد تیز کرنے کی ضرورت

دستاویزی ثبوت، ملی بیداری اور یکجہتی واتحاد پر زور۔ نئی دلی میں اے پی سی آر کی کانفرنس

نئی دلی:(دعوت نیوز ڈیسک)

دارالحکومت دلی میں اسوسی ایشن فار پروٹیکشن آف سول رائٹس (اے پی سی آر) کے زیر اہتمام منعقدہ ایک اہم کانفرنس میں ملک کے مختلف حصوں میں مساجد کے خلاف انہدامی کارروائیوں، مذہبی آزادی، آئینی حقوق اور اقلیتوں کو درپیش قانونی چیلنجوں پر تفصیلی گفتگو کی گئی۔ اس اجلاس میں سینئر وکلا، سابق پارلیمانی شخصیات، انسانی حقوق کے کارکنوں، دانشوروں اور مختلف ریاستوں سے آئے ہوئے نمائندوں نے شرکت کی اور اس بات پر زور دیا کہ مذہبی مقامات سے متعلق تنازعات کو طاقت یا انتظامی کارروائی کے بجائے قانون اور آئین کی روشنی میں حل کیا جانا چاہیے۔

کانفرنس میں سابق مرکزی وزیر اور ممتاز قانون داں سلمان خورشید، سابق چیئرمین دہلی اقلیتی کمیشن ظفرالاسلام خان، جماعت اسلامی ہند کے قومی سکریٹری ملک معتصم خان، سابق رکن پارلیمنٹ محمد ادیب، مصنفہ سیدہ حمید، انسانی حقوق کے کارکن جان دیال اور دیگر مقررین نے اپنے اپنے زاویہ نظر پیش کیے۔ اگرچہ خطابات کے انداز مختلف تھے لیکن ان میں ایک قدر مشترک نمایاں رہی کہ ملک کے آئینی ڈھانچے، عدالتی نظام اور قانونی عمل پر اعتماد برقرار رکھتے ہوئے حقوق کے تحفظ کی جدوجہد جاری رکھی جائے۔

ظفرالاسلام خان نے مساجد اور مکانات کی مسماری کو محض انفرادی یا مقامی واقعات قرار دینے کے بجائے ایک وسیع سماجی و سیاسی رجحان سے جوڑا اور کہا کہ ایسے معاملات کی مکمل قانونی پیروی اور تاریخی دستاویز بندی ناگزیر ہے۔ ان کے مطابق عدالتوں میں دائر کیے گئے مقدمات صرف فوری ریلیف کا ذریعہ نہیں بنتے بلکہ وہ مستقبل کے لیے ایک مستند ریکارڈ بھی محفوظ کرتے ہیں، جیسا کہ بابری مسجد مقدمے کی مختلف عدالتی اور تاریخی دستاویزات سے ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ انسانی حقوق سے متعلق مبینہ خلاف ورزیوں کو منظم انداز میں مرتب کر کے قومی اور بین الاقوامی سطح پر پیش کیا جانا چاہیے۔

سلمان خورشید نے اپنے خطاب میں قانونی تیاری کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ جذباتی ردعمل کے بجائے صبر، تنظیم اور مضبوط دستاویزی بنیادوں پر استوار حکمت عملی زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتی ہے۔ ان کے مطابق مذہبی اداروں اور متعلقہ فریقوں کو اپنی تمام قانونی دستاویزات، ریکارڈ اور ملکیتی ثبوت مکمل رکھنے چاہییں تاکہ کسی بھی عدالتی کارروائی میں مؤثر دفاع کیا جا سکے۔ انہوں نے یہ اعتماد بھی ظاہر کیا کہ عدلیہ میں ایسے جج موجود ہیں جو آئینی اصولوں، انصاف اور سیکولر اقدار کے تحفظ کے لیے سنجیدہ کردار ادا کر رہے ہیں۔

ملک معتصم خان نے اپنی گفتگو میں موجودہ حالات کو مایوسی کا سبب بنانے کے بجائے انہیں خود احتسابی اور داخلی استحکام کا موقع قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر مسلمان تعلیم، معاشی خود انحصاری، اخلاقی تربیت اور سیاسی شعور پر توجہ دیں تو وہ طویل مدت میں زیادہ مضبوط اور باوقار مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے حلقہ بندی سمیت مستقبل کی بعض سیاسی پیش رفتوں کے تناظر میں سیاسی بیداری اور جمہوری عمل میں مؤثر شرکت کی ضرورت پر بھی زور دیا۔

دیگر مقررین نے بھی انہدامی کارروائیوں اور ان کے سماجی اثرات پر تشویش ظاہر کی۔ محمد ادیب نے انتظامی اہلکاروں سے احتساب کا مطالبہ کیا۔ سیدہ حمید نے مختلف مذہبی برادریوں کے درمیان باہمی اعتماد اور یکجہتی کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا، جبکہ جان دیال نے اقلیتی اداروں کو درپیش چیلنجوں کا ذکر کیا۔ اے پی سی آر کے قومی سکریٹری ندیم خان نے دعویٰ کیا کہ مختصر عرصے میں مختلف ریاستوں میں متعدد مساجد کے خلاف کارروائیاں ہوئی ہیں جن کے نفسیاتی اور سماجی اثرات بھی نمایاں ہیں۔ راجستھان، اتر پردیش اور دیگر علاقوں سے آئے ہوئے نمائندوں نے بھی اپنے اپنے علاقوں کے واقعات پیش کیے اور بعض انہدامی کارروائیوں کو نوٹس اور قانونی تقاضوں سے عاری قرار دیا۔

کانفرنس کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ بیشتر مقررین نے احتجاج یا ردعمل کے بجائے قانونی چارہ جوئی، عدالتی نگرانی، شواہد کے تحفظ اور آئینی ذرائع کو ترجیح دینے کی تلقین کی۔ ان کے نزدیک یہ راستہ نہ صرف جمہوری اقدار سے ہم آہنگ ہے بلکہ مستقبل میں انصاف کے امکانات کو بھی زندہ رکھتا ہے۔ اسی تناظر میں یہ مطالبہ بھی سامنے آیا کہ انتظامی فیصلوں میں شفافیت، پیشگی نوٹس، غیر جانبداری اور قانون کی یکساں عمل داری کو یقینی بنایا جائے۔

یہ کانفرنس صرف مساجد کی مسماری کے چند واقعات تک محدود بحث نہیں تھی بلکہ اس نے ایک وسیع تر سوال کو نمایاں کیا کہ متنوع مذاہب، ثقافتوں اور روایات پر مشتمل ہندوستان میں آئینی ضمانتوں، مذہبی آزادی اور قانون کی حکم رانی کو کس طرح مضبوط بنایا جائے۔ مقررین کا اصرار تھا کہ عبادت گاہوں کا تحفظ کسی ایک مذہب یا طبقے کا مسئلہ نہیں بلکہ آئینی نظم، شہری مساوات اور جمہوری اقدار کی بقا سے جڑا ہوا سوال ہے۔ ان کے نزدیک اختلافات کا پائیدار حل طاقت کے استعمال میں نہیں بلکہ شفاف قانونی عمل، غیر جانب دار اداروں اور انصاف پر مبنی حکم رانی میں مضمر ہے۔

جدید اسلامی فکر اور سائنس کے درمیان اجتہادی مکالمے کی ضرورت

انسٹیٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز میں مشہور اسلامی اسکالر اور معاصر افکار و نظریات کے ماہر پروفیسر ابراہیم موسیٰ کا خطبہ

نئی دلی:(دعوت نیوز ڈیسک):

معروف اسلامی مفکر، دانشور، معاصر مسلم افکار و نظریات کے ماہر اور یونیورسٹی آف نوٹریڈم (امریکہ) کے پروفیسر ابراہیم موسیٰ نے انسٹیٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز (آئی او ایس) میں "جدید مسلم الٰہیات اور سائنس" کے موضوع پر ایک فکر انگیز خطبہ پیش کیا۔ اس پروگرام میں اساتذہ، محققین، طلبہ اور مختلف علمی و فکری حلقوں سے وابستہ افراد کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ آئی او ایس کے سکریٹری جنرل محمد عالم کی دعوت پر تشریف لانے والے مہمان خطیب نے آئی او ایس سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے اس بروقت قدم پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ یاد رہے کہ اس موضوع پر حال ہی میں ان کی کتاب منظر عام پر آئی ہے اور علمی حلقوں میں زیر بحث ہے۔

اپنے خطبہ میں پروفیسر ابراہیم موسیٰ نے جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے تیزی سے بدلتے ہوئے دور میں مسلم الٰہیات کو درپیش چیلنجز اور مواقع پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مسلم علماء اور دانشوروں کو جدید سائنسی علوم کے ساتھ مثبت اور تعمیری انداز میں مکالمہ قائم کرنا چاہیے، جبکہ اسلامی روایت کی اخلاقی اور روحانی بنیادوں سے مضبوط وابستگی بھی برقرار رکھنی چاہیے۔ ان کے مطابق مسلم الٰہیات کو صرف کلاسیکی مباحث تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ اسے سائنس، ٹیکنالوجی اور انسانی علم میں ہونے والی نئی پیش رفت سے پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دینے کے قابل ہونا چاہیے۔ پروفیسر ابراہیم موسیٰ نے اپنے لیکچر میں اس سوال کو مرکزی حیثیت دی کہ جدید مسلم الٰہیات (Modern Muslim Theology) سائنس کے ساتھ ایک تخلیقی اور نتیجہ خیز مکالمہ قائم کرنے میں کیوں دشواری محسوس کرتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ مسئلہ محض مذہب اور سائنس کے درمیان تضاد کا نہیں بلکہ مسلم فکری روایت کی تاریخی تشکیل اور جدید دور کے چیلنجوں سے متعلق ہے۔ انہوں نے اس عام تصور پر تنقید کی کہ اسلام کا ایک "سنہری دور" تھا جسے امام غزالی نے تباہ کر دیا۔ ان کے مطابق یہ بیانیہ مستشرقین اور بعض جدید مفکرین کا پیدا کردہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم علمی روایت غزالی کے بعد بھی مختلف صورتوں میں جاری رہی اور فلسفہ، منطق، فقہ، کلام اور تصوف کے میدانوں میں علمی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ "غزالی نے اسلامی سائنس کو تباہ کر دیا" ایک حد سے زیادہ سادہ اور تاریخی طور پر غیر علمی دعویٰ ہے۔ اسی طرح انہوں نے اس خیال پر بھی سوال اٹھایا کہ "اسلام نے سائنس کی دریافت نہیں کی"۔ ان کے مطابق مسلم تہذیب کا اصل کارنامہ سائنس ایجاد کرنا نہیں بلکہ علم کے مختلف سرچشموں—وحی، عقل اور تجربہ—کو ایک وسیع فکری نظام میں یکجا کرنا تھا۔

اس سوال کے جواب میں کہ جدید مسلم الٰہیات کو سائنس کے ساتھ مشکل کیوں پیش آتی ہے؟ پروفیسر موسیٰ نے تین بنیادی وجوہات بیان کیں: (1) استعماریت (2) نصوصیت (3) فرسودہ فکری نمونے۔

انہوں نے کہا کہ استعماری دور (کولونیل ازم) نے مسلم معاشروں کے سیاسی، تعلیمی اور فکری ڈھانچوں کو شدید متاثر کیا۔ مغربی طاقتوں کی برتری نے مسلمانوں میں احساسِ شکست پیدا کیا اور علمی اعتماد کو مجروح کیا۔ نتیجتاً مسلم فکر کا بڑا حصہ اجتہاد کے بجائے دفاعی رد عمل (Defensive Response) میں تبدیل ہو گیا۔ اسی طرح جدید دور میں مسلم دنیا کے بعض حلقوں میں ایسا رجحان پیدا ہوا جس میں مذہبی نصوص کو ان کے تاریخی، سماجی اور علمی سیاق سے الگ کر کے پڑھا جانے لگا۔ اس نصوص پرستی نے عقل، فلسفہ اور تنقیدی فکر کی ان روایتوں کو کمزور کیا جو اسلامی تہذیب کا اہم حصہ تھیں۔ نتیجتاً سائنس اور مذہب کے درمیان مکالمے کی گنجائش محدود ہو گئی۔ جبکہ بہت سے مسلم ادارے اور مذہبی مکاتب فکر آج بھی ان علمی نمونوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں جو جدید سائنسی اور فلسفیانہ مباحث سے پہلے کے زمانے میں تشکیل پائے تھے۔ جب نئے سوالات پر پرانے سانچوں سے جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے تو فکری کشمکش پیدا ہوتی ہے۔

پروفیسر موسیٰ نے یہ بھی واضح کیا کہ جدید سائنس اور مغربی جدیدیت کے دباؤ کا جواب تمام مسلم علماء نے یکساں انداز میں نہیں دیا۔ انہوں نے اس سلسلے میں چار نمایاں مثالوں کا ذکر کیا۔ ایک، مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی (متوفی 1910) نے جدید سائنس اور مغربی علوم کے حصول کو مسلمانوں کی ترقی کے لیے ضروری سمجھا۔ وہ جدید تعلیم اور سائنسی شعور کے حامی تھے اور دونوں علمی روایتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دوسرے علامہ حسین الجسر (متوفی 1909) جنہوں نے اپنی معروف کتاب "الرسالۃ الحمیدیۃ" میں ڈارون ازم اور جدید سائنس کے بعض نظریات کو اسلامی عقائد کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ان کا نقطہ نظر مفاہمتی (Accommodationist) تھا۔ تیسرے علامہ انور شاہ کشمیری (متوفی 1933) نے حدیث اور روایتی علوم کی بنیاد پر جدید سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی۔ ان کے ہاں جدیدیت کے ساتھ مکالمہ موجود ہے لیکن بنیادی اعتماد کلاسیکی علمی روایت پر قائم رہتا ہے۔ جبکہ مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی 1943) نے روحانی اور اخلاقی اصلاح کو بنیادی اہمیت دی۔ ان کے نزدیک جدید سائنس مفید ہو سکتی ہے لیکن انسانی فلاح کا اصل سرچشمہ وحی اور اخلاقی تربیت ہے۔ اس لیے انہوں نے سائنسی ترقی کو مذہبی و اخلاقی رہنمائی کے تابع رکھنے پر زور دیا۔ پروفیسر ابراہیم موسیٰ کے مطابق جدید مسلم الٰہیات کا اصل مسئلہ سائنس سے دشمنی نہیں بلکہ ایک ایسے فکری سانچے کی تلاش ہے جو وحی، عقل اور سائنسی علم کے درمیان بامعنی تعلق قائم کر سکے۔ ان کے نزدیک مسلم دنیا کو ماضی کی تقلید یا مغرب کی نقالی کے بجائے ایک نئی فکری جرات اور تخلیقی اجتہاد کی ضرورت ہے تاکہ جدید سائنس کے چیلنجوں کا سامنا اعتماد اور بصیرت کے ساتھ کیا جا سکے۔ انہوں نے اسلامی تہذیب کی علمی روایت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ماضی میں مسلم علماء نے وحی اور عقل کے درمیان ایک متوازن اور فعال تعلق قائم کیا تھا، جس کے نتیجے میں علم و تحقیق کے مختلف میدانوں میں نمایاں ترقی ہوئی۔ پروفیسر موسیٰ نے اس روایت کی تجدید کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ تنقیدی فکر، علمی کشادگی اور بین العلومی مکالمہ عصر حاضر میں مسلم فکری احیاء کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان کے مطابق سائنس اور الٰہیات کے درمیان بامعنی مکالمہ انسان اور کائنات کے بارے میں زیادہ جامع اور متوازن فہم پیدا کر سکتا ہے۔

انسٹیٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز میں پروفیسر ابراہیم موسیٰ خطاب کرتے ہوئے۔

پروگرام کا آغاز جناب نسیم احسن نے آیات قرآن کی تلاوت و ترجمہ سے کیا، اجلاس کی صدارت انسٹیٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے چیئرمین پروفیسر افضل وانی نے کی۔ اپنے صدارتی کلمات میں انہوں نے پروفیسر ابراہیم موسیٰ کے خطاب کو نہایت بصیرت افروز اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس لیکچر نے مسلم فکری روایت کے مستقبل اور جدید سائنسی ترقیات کے تناظر میں کئی اہم سوالات کو اجاگر کیا ہے۔ پروفیسر وانی نے اس بات پر زور دیا کہ تعلیمی اور تحقیقی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے علمی مباحث کو فروغ دیں جو معاشرے اور اکیڈمیوں دونوں کے لیے مفید ثابت ہوں۔ اس سے قبل سوال و جواب کا ایک دلچسپ اور معلوماتی سیشن منعقد ہوا جس میں خطیب نے ڈاکٹر ناز خیر، محمد علی، ڈاکٹر تالیف حیدر وغیرہ کے سوالات کے جوابات دیے، جبکہ خطیبِ محترم کا تعارف ڈاکٹر جاوید اختر اور خطبے پر تبصرہ پروفیسر محمد اسحاق نے پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت شیخ محمد نظام الدین نے کی۔ پروگرام کے اختتام پر پروفیسر حَسینہ ہاشیہ نے شکریہ کی تجویز پیش کی۔ انہوں نے پروفیسر ابراہیم موسیٰ، صدرِ مجلس، شرکاء اور منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس علمی نشست کو کامیاب بنانے پر سب کو مبارکباد دی۔ یہ لیکچر انسٹیٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کی اس مسلسل کوشش کا حصہ تھا جس کا مقصد مذہب، معاشرہ اور علم کے باہمی تعلقات سے متعلق معاصر موضوعات پر سنجیدہ علمی مکالمے کو فروغ دینا ہے۔

दावत هفت روزہ
دعوت نئی دہلی
DAWAT, NEW DELHI
www.dawatnews.net

05/جولائی تا 11/جولائی 2026

جب اذانیں روک دی گئیں۔۔

یوگی آدتیہ ناتھ کے دورے پر سیکیورٹی انتظامات کا حوالہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کیمپس میں احتجاجی آوازیں بلند

(دعوت نیوز نیٹ ورک)

اتر پردیش کے وزیرِ اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کے دورہ علی گڑھ کے دوران اے ایم یو کیمپس میں اذان کے لاؤڈ اسپیکر بند کیے جانے کے واقعے نے ایک نئی بحث چھیڑ دی ہے۔ طلبہ کا کہنا ہے کہ اگر سیکیورٹی انتظامات کے نام پر ایسا اقدام کیا گیا تو یہ مذہبی شعائر اور آئینی آزادی کے حوالے سے تشویش ناک نظیر بن سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر انتظامیہ سے وضاحت طلب کی جا رہی ہے۔

متعدد طلبہ کے مطابق 22 جون کو کیمپس کی مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان کئی گھنٹوں تک بند رکھی گئی۔ اگرچہ نمازیں ادا ہوئیں مگر اذان کی عام سماعت کو محدود کر دیا گیا۔ دوسری طرف انتظامیہ اور پولیس نے ایسے کسی باضابطہ حکم سے انکار کیا ہے جس کے باعث معاملہ مزید حساس ہو گیا ہے۔

ایک طالب علم امان کے مطابق وہ آفتاب ہال کی مسجد میں اذان دینے جا رہے تھے کہ انہیں بتایا گیا کہ اگلی صبح فجر تک لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ کئی دیگر طلبہ نے بھی دعویٰ کیا کہ یہ فیصلہ انتظامی ہدایات کے تحت نافذ ہوا۔

یہاں اصل سوال صرف لاؤڈ اسپیکر کا نہیں ہے۔ اذان مسلمانوں کے لیے محض اطلاع کا ذریعہ نہیں بلکہ ان کی اجتماعی دینی شناخت اور روزمرہ مذہبی زندگی کا ایک نمایاں اظہار ہے۔ اگر کسی پابندی کی واقعی ضرورت تھی تو کیا اس کے لیے شفاف اور تحریری طریقۂ کار اختیار کیا گیا؟ کیا متعلقہ فریقوں سے مشاورت ہوئی؟ اور کیا اسی نوعیت کے اصول دیگر مذہبی یا عوامی سرگرمیوں پر بھی یکساں طور پر لاگو ہوتے ہیں؟

یہ بھی حقیقت ہے کہ قانون اور سیکیورٹی انتظامات ریاست کی ذمہ داری ہیں لیکن ایک جمہوری معاشرے میں مذہبی آزادی اور ریاستی اختیار کے درمیان توازن بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ ایسے فیصلے، خواہ عارضی ہی کیوں نہ ہوں اگر یک طرفہ ہوں تو وہ محض انتظامی کارروائی نہیں رہتے بلکہ اعتماد کے بحران کو جنم دیتے ہیں۔

اسی لیے طلبہ کے مطالبات کو محض جذباتی ردِ عمل قرار دے کر نظر انداز کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اگر واقعی کوئی پابندی عائد کی گئی تھی تو انتظامیہ کو اس کی قانونی بنیاد اور ضرورت واضح کرنی چاہیے اور اگر ایسا کچھ نہیں ہوا تو پھر گردش کرنے والی اطلاعات کی وضاحت ضروری ہے۔

تعلیمی ادارے اعتماد، مکالمے اور آئینی اقدار کے مراکز ہوتے ہیں۔ ایسے میں ضروری ہے کہ سیکیورٹی کے تقاضے اور مذہبی حقوق ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں بلکہ ایک متوازن اور شفاف نظام کے تحت ساتھ ساتھ چلتے ہوئے نظر آئیں۔

عصری چیلنجز پر علماء رہنمائی کریں: ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی

مجلسِ علماء گجرات کے رہنمائی پروگرام میں جدید تعلیم، معاشی امکانات اور قیادت سازی پر زور

احمد آباد: (دعوت نیوز ڈیسک)

"علماء کو عصری چیلنجوں کو سمجھتے ہوئے امت کی رہنمائی اور خیرِ عام کے وسیع تر دائرے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور علم و دعوت کے میدان میں مؤثر قیادت فراہم کرنی چاہیے" — ان خیالات کا اظہار جماعتِ اسلامی ہند کے مرکزی سکریٹری ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے مجلسِ علماء گجرات کے زیرِ اہتمام منعقدہ علماء و حفاظ کے رہنمائی پروگرام سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ بدلتے ہوئے سماجی، تعلیمی اور معاشی حالات میں اہلِ علم کی ذمہ داریاں پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہو چکی ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ علماء دینی بصیرت کے ساتھ عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سمجھیں اور معاشرے کی فکری، تعلیمی اور اخلاقی رہنمائی میں فعال کردار ادا کریں۔

مجلسِ علماء گجرات کے زیرِ اہتمام منعقدہ علماء و حفاظ کے رہنمائی پروگرام میں جماعتِ اسلامی ہند کے مرکزی سکریٹری ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی اور دیگر مقررین خطاب کر رہے ہیں۔

اسی مقصد کے تحت 28 جون 2026 بروز اتوار گجرات ٹوڈے آڈیٹوریم، احمد آباد میں مجلسِ علماء گجرات کی جانب سے علماء، حفاظ اور مدارس کے طلبہ کے لیے ایک روزہ رہنمائی پروگرام منعقد کیا گیا تھا، جس میں تعلیم، روزگار، پیشہ ورانہ ترقی، قیادت سازی اور عصری مواقع سے استفادے کے موضوعات پر تفصیلی گفتگو کی گئی۔

مولانا رضی الاسلام ندوی نے اس بات پر زور دیا کہ امت کی رہنمائی کا منصب صرف رسمی تدریس تک محدود نہیں بلکہ اس کے لیے معاشرے کے بدلتے تقاضوں، فکری چیلنجز اور نئی نسل کے مسائل کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب علم، بصیرت اور عصر شناسی جمع ہو جائیں تو علماء معاشرے میں مؤثر اور مثبت قیادت فراہم کر سکتے ہیں۔

مجلسِ علماء گجرات کے کنوینر جناب شکیل احمد راجپوت نے افتتاحی کلمات پیش کیے۔ انہوں نے پروگرام کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ حالات میں علماء اور حفاظ کے لیے صرف روایتی علمی دائرے تک محدود رہنا کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ نئی مہارتیں حاصل کریں، سماجی ضروریات کو سمجھیں اور مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔

جناب سہیل ساچورا، ڈپٹی منیجر امول ڈیری نے "آمدنی بڑھانے کے جدید ذرائع" کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بدلتی ہوئی معاشی صورتِ حال میں نئے مواقع سے آگاہی اور عملی منصوبہ بندی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ انہوں نے شرکاء کو مختلف ممکنہ راستوں اور وسائل سے بھی متعارف کروایا

اس موقع پر مفتی ساجد صدیقی یلیم فلاحی، فاؤنڈر ڈائریکٹر رائٹ وے اسکول نے اپنے تعلیمی اور عملی سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ علماء اگر ذہنی رکاوٹوں سے باہر نکل کر وسیع امکانات کے ساتھ آگے بڑھیں تو وہ مختلف شعبوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں اور معاشرے میں مثبت تبدیلی کے مؤثر محرک بن سکتے ہیں۔

جدید تعلیم اور فراغت کے بعد دستیاب امکانات کے موضوع پر جناب شارق انصر، منیجر ایجوکیشن پروگرام، ہیومن ویلفیئر فاؤنڈیشن دہلی نے کہا کہ علماء اور مدارس کے طلباء میں بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں تاہم انہیں درست سمت، مناسب رہنمائی اور تعلیمی مواقع سے جوڑنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ وسیع سطح پر خدمات انجام دے سکیں۔

اس موقع پر ڈاکٹر افتخار ملک، سکریٹری مرکزی تعلیمی بورڈ گجرات نے بھی خطاب کیا اور ہیومینیٹز کے طلباء کے لیے اسکالرشپ اسکیم کے اعلان کے ساتھ تعلیمی معاونت اور رہنمائی کے امکانات پر روشنی ڈالی۔

جناب محمد رضا اللہ خان، نیشنل ڈائریکٹر "مانو" حیدر آباد نے یونیورسٹی میں دستیاب مختلف کورسز، داخلہ امکانات اور اعلیٰ تعلیم کے راستوں کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کیں۔ انہوں نے علماء و حفاظ کو ترغیب دی کہ وہ اپنی دینی بنیاد کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف پیشہ ورانہ اور علمی شعبوں میں بھی آگے بڑھیں۔

گجرات کے مختلف اضلاع سے علماء، حفاظ اور مدارس کے طلباء نے بڑی تعداد میں پروگرام میں شرکت کی اور مقررین سے انفرادی ملاقاتوں کے ذریعے تعلیمی، پیشہ ورانہ اور سماجی موضوعات پر رہنمائی حاصل کی۔

پروگرام کے اختتام پر جناب سفیان نے اظہارِ تشکر کیا جبکہ نظامت کے فرائض مولانا بشیر نے انجام دیے۔

مہاراشٹر کے دو المناک واقعات: کیا نفرت اب سماجی بحران بنتی جا رہی ہے؟

بسلسلہ صفحہ نمبر-11

واضح پیغام ملت کو پہنچانا چاہیے کہ اگر آپ کہیں گھر جاتے ہیں تو آپ اپنے دفاع کا حق استعمال کرتے ہوئے کارروائی کریں اور مجبوری کے ساتھ مرنے کے بجائے بہادری کے ساتھ جان دیں، تاکہ فسادیوں کو بھی معلوم ہو کہ ان کی بھی جان لی جا سکتی ہے۔ تو یہ ایک بہت واضح اور مضبوط موقف ہماری سب ملی جماعتوں کی طرف سے مشترکہ طریقے پر آنا چاہیے۔ یہ کوئی غیر قانونی بات نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی تشدد کی بات ہے، لیکن اس سے یہ ہوگا کہ دوسرے یہ محسوس کریں گے اور اگر کہیں کہیں اس پر عمل بھی ہوگا تو اس کے بہت مثبت نتائج بھی سامنے آئیں گے، جیسا کہ اس سے پہلے سامنے آ چکے ہیں۔ اس طرح سے انہوں نے واضح طور پر ایک پیغام دینے کی کوشش کی ہے تاکہ ماب لنچنگ کے واقعات میں کمی لائی جا سکے۔ اب ہو یہ رہا ہے کہ ماب لنچنگ کا شکار بننے والے افراد کسی بھی طرح کی جوابی کارروائی یہ سوچ نہیں کر رہے ہیں کہ قانون کو ہاتھ میں لینا صحیح نہیں ہے جبکہ حملہ آوروں کو قانون کو ہاتھ میں لینے میں کوئی باک نہیں رہا ہے۔ ایسے میں ہمیں اپنے دفاع میں جوابی حملہ کرنا ہوگا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم وقتی جذبات اور سیاسی وابستگیوں سے اوپر اٹھ کر ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کریں جہاں اختلاف قتل کا سبب نہ بنے، جہاں مذہب نفرت نہیں بلکہ اخلاق و انسانیت کا درس دے، اور جہاں ہر شہری خود کو محفوظ محسوس کر سکے۔ کیونکہ اگر معاشرے میں انسان کی جان کی حرمت ختم ہو جائے تو پھر ترقی، سیاست، معیشت اور طاقت سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔

کھنڈوا میں 38 گھروں کی مسماری پر روک
ہائی کورٹ کا عبوری حکم۔ اے پی سی آر کی عرضی پر فیصلہ

(دعوت بیورو رپورٹ)

مدھیہ پردیش ہائی کورٹ نے کھنڈوا کے بدھیا تولا گاؤں میں 38 مکانات کے انہدام پر عبوری روک لگا دی۔

عدالتی حکم مورخہ 28 جون 2026 کے مطابق زبردستی کارروائی کو اگلی سماعت تک روک دیا گیا ہے۔ اگلی سماعت تین ہفتوں کے بعد مقرر ہے۔

اسوسی ایشن فار پروٹیکشن آف سول رائٹس (اے پی سی آر) نے مدھیہ پردیش کے ضلع کھنڈوا کے بدھیا تولا گاؤں کے اُن رہائشیوں کو بڑی قانونی راحت دلائی ہے، جن کے مکانات پر بلڈوزر کارروائی کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ مدھیہ پردیش ہائی کورٹ نے علاقے کے 38 مکانات کے خلاف انہدامی کارروائی پر عبوری روک (اسٹے) کا حکم جاری کیا ہے۔

بدھیا تولا گاؤں، مدھیہ پردیش کے ضلع کھنڈوا کی ایٹوا تحصیل میں واقع ہے۔ یہاں مبینہ طور پر مویشی ذبح کرنے کے ایک معاملے میں پولیس نے 9 افراد کے خلاف مقدمہ درج کیا تھا۔ مرکزی ملزم سمیت تمام ملزموں کے خلاف ایف آئی آر درج کی گئی، جبکہ کلیدی ملزم پر قومی سلامتی قانون (این ایس اے) کے تحت بھی کارروائی کی گئی۔

20 جون 2026 کو چند ہندوتوا تنظیموں کے کارکنوں نے ملزموں کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ کرتے ہوئے منڈی ہائی وے کو بند کر دیا تھا، اس کے بعد ضلعی انتظامیہ نے مبینہ طور پر گاؤں میں چند غیر مجاز مکانات کو منہدم کر دیا اور دیگر رہائشیوں کو بھی انہدامی کارروائی کی نوٹسیں جاری کی گئیں۔

متاثرہ خاندانوں کی درخواست پر اے پی سی آر نے فوری قانونی مدد فراہم کرتے ہوئے جبل پور میں مدھیہ پردیش ہائی کورٹ سے رجوع کیا جس نے ابتدائی مرحلے میں دائر درخواستوں پر سماعت کرتے ہوئے عدالت نے چار مکانات کے انہدام پر عبوری روک لگا دی ہے۔ بعد ازاں مزید 47 خاندانوں کو بھی نوٹسیں جاری کی گئیں، جس پر اے پی سی آر نے 34 خاندانوں کی جانب سے دوبارہ عدالت سے رجوع کیا۔ ان درخواستوں پر بھی ہائی کورٹ نے عبوری تحفظ فراہم کرتے ہوئے انہدامی کارروائی پر روک لگا دی ہے۔ اس طرح اب مجموعی طور پر 38 مکانات کے خلاف بلڈوزر کارروائی معطل ہو چکی ہے۔

اے پی سی آر نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ اگرچہ فوجداری مقدمات کی تحقیقات قانون کے مطابق جاری رہنی چاہئیں، لیکن قانونی کارروائی مکمل کیے بغیر رہائشی مکانات کو منہدم کرنا آئینی ضمانتوں اور قانون کی حکم رانی کے منافی ہے۔ تنظیم کے مطابق بلڈوزر کارروائی عدالتی عمل کا متبادل یا اجتماعی سزا کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ اے پی سی آر نے اس عزم کا بھی اعادہ کیا کہ وہ متاثرہ شہریوں کو قانونی امداد فراہم کرتی رہے گی اور عدالتی ذرائع سے ان کے آئینی حقوق کے تحفظ کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھے گی۔

اے پی سی آر کی جانب سے سینئر ایڈووکیٹ کبیر پال، ایڈووکیٹ آریان اُرمالیا اور ان کی قانونی ٹیم نے عدالت میں متاثرہ خاندانوں کی نمائندگی کی۔

عالمی یومِ ماحولیات: اے ایم یو میں طلبہ کو سبز مستقبل کی تعمیر کا پیغام

علی گڑھ (دعوت نیوز ڈیسک)

ماحولیاتی تحفظ اور پائیدار ترقی کے شعور کو فروغ دینے کی غرض سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اقتصادیات نے عالمی یومِ ماحولیات کے موقع پر آن لائن پوسٹر سازی اور نعرہ نویسی کے مقابلوں کا انعقاد کیا، جن میں مختلف فیکلٹیوں اور شعبہ جات کے طلبہ نے جوش و خروش سے حصہ لیا۔

اس سرگرمی کا بنیادی مقصد نوجوان نسل میں موسمیاتی تبدیلی، سبز معیشت اور قابلِ تجدید توانائی جیسے اہم موضوعات کے حوالے سے تخلیقی سوچ پیدا کرنا اور انہیں ماحول دوست طرزِ فکر اختیار کرنے کی ترغیب دینا تھا۔ مقابلوں کے دوران طلبہ نے اپنے نعروں اور پوسٹروں کے ذریعے ماحولیات کے تحفظ اور پائیدار مستقبل کے لیے قابلِ عمل تصورات پیش کیے۔

تقریب سے خطاب کرتے ہوئے شعبہ اقتصادیات کے چیئرپرسن پروفیسر شہروز عالم رضوی نے کہا کہ تعلیمی اداروں کی ذمہ داری صرف نصابی تعلیم تک محدود نہیں بلکہ ایسے مواقع فراہم کرنا بھی ہے جو طلبہ میں سماجی ذمہ داری اور ماحول دوست شعور کو فروغ دیں۔ انہوں نے اس موقع پر منعقدہ شجر کاری مہم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ایک سرسبز مستقبل کے لیے عملی اقدامات اور عوامی بیداری ساتھ ساتھ چلنا ضروری ہیں۔

مقابلوں کے اختتام پر نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبہ میں اسناد تقسیم کی گئیں، جبکہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کی بھرپور شرکت کو سراہا گیا۔

لکھنؤ کے کوچنگ سنٹر میں آتشزدگی کا واقعہ انتہائی افسوسناک
غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائیں: امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند، یوپی مشرق

لکھنؤ: (دعوت نیوز ڈیسک)

جماعت اسلامی ہند، یوپی مشرق کے امیر حلقہ ڈاکٹر ملک محمد فیصل نے لکھنؤ میں واقع ایک کوچنگ میں پیش آنے والے آتشزدگی کے دردناک واقعہ پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس حادثہ میں پندرہ طلباء کی ہلاکت نہایت افسوسناک اور دل دہلا دینے والی ہے۔ اس اندوہناک سانحہ نے پورے شہر اور ریاست کو سوگوار کر دیا ہے۔

انہوں نے ہلاک ہونے والے طلبہ کے اہل خانہ سے دلی تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ مہلوکین کے لواحقین کو صبر دے اور زخمیوں کو جلد از جلد مکمل صحت یابی نصیب فرمائے۔

امیر حلقہ ڈاکٹر ملک محمد فیصل نے کہا کہ اس نوعیت کے حادثات مسلسل پیش آ رہے ہیں، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تعلیمی اور تجارتی اداروں میں فائر سیفٹی کے معیارات، ہنگامی حالات سے نمٹنے کی تیاری اور حفاظتی ضوابط پر مؤثر عمل درآمد میں کوتاہیاں موجود ہیں۔

انہوں نے حکومت اتر پردیش اور متعلقہ محکموں سے مطالبہ کیا کہ اس حادثہ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائیں، مہلوک طلباء کے اہل خانہ کو معاوضہ دیا جائے اور زخمیوں کے علاج و معالجہ کا مناسب بندوبست کیا جائے۔

انسانی حقوق تنظیموں کا ”غیر اعلانیہ ایمرجنسی“ اور جمہوریت کو درپیش خطرات پر اظہارِ تشویش

آزاد میڈیا کے بغیر مضبوط جمہوریت ممکن نہیں: ہارتوش بال-جمہوریت کے دفاع کی اپیل۔ شہری سماج کے کردار پر زور

نئی دلی (دعوت نیوز ڈیسک)

انسانی حقوق کے شعبے کی چار سرکردہ تنظیموں، پیپلز یونین فار سول لبرٹیز (پی یو سی ایل) دہلی، پیپلز یونین فار ڈیموکریٹک رائٹس (پی یو ڈی آر) سٹیزنز فار ڈیموکریسی (سی ایف ڈی) اور جن ہستکشیپ نے منگل کے روز 1975ء کی ایمرجنسی کے اعلان کی سالگرہ کے موقع پر، پریس کلب آف انڈیا میں مشترکہ طور پر ”جمہوریت کو درپیش خطرات اور آئندہ کے چیلنجز“ کے عنوان سے ایک مذاکرے کا انعقاد کیا۔ اس پروگرام میں قانونی ماہرین، صحافیوں اور شہری حقوق کے کارکنان نے شرکت کی اور ایمرجنسی کے تجربات اور اس کے اسباق کی روشنی میں ہندوستان کے جمہوری اداروں کو درپیش موجودہ خطرات کا جائزہ لیا۔

ہارتوش بال، مدیرِ جریدہ کارواں، نے اپنے خطاب میں کہا کہ اگرچہ ایمرجنسی کا خاتمہ عوامی تحریک اور انتخابی شکست کے ذریعے ہوا تھا لیکن آج بھارتی جمہوریت کو جن چیلنجز کا سامنا ہے، وہ اپنی نوعیت میں مختلف اور بعض پہلوؤں سے زیادہ گہرے اور دیرپا ہیں۔ ان کے مطابق ایمرجنسی کے دور میں اخبارات پر براہِ راست سنسرشپ نافذ کی جاتی تھی، جبکہ موجودہ دور میں مرکزی دھارے کا میڈیا رسمی پابندیوں کے بغیر ہی بڑی حد تک اقتدار کے نظریاتی رجحانات سے ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ یہ صورتِ حال آزادی کے بعد سے موجود ایک ساختی مسئلے کا نتیجہ ہے کیونکہ میڈیا کی ملکیت طویل عرصے سے بااثر کاروباری حلقوں کے ہاتھوں میں مرتکز رہی اور اس میدان میں کوئی بنیادی اصلاح نہ ہو سکی ہے۔ ان کے مطابق صنعتی ومالیاتی طبقوں کا اثر میڈیا پر ہمیشہ نمایاں رہا ہے اور ان کے سیاسی و نظریاتی رجحانات اکثر ہندوتوا فکر سے قربت رکھتے رہے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ معاشی آزاد کاری کے بعد خبر رساں اداروں پر کارپوریٹ اثر ورسوخ مزید بڑھا، جبکہ صحافیوں کے تحفظ سے متعلق قانونی ڈھانچے کے کمزور ہونے سے صحافت زیادہ غیر محفوظ ہوتی گئی اور صحافی روزگار کے خوف کے تحت آزادانہ رپورٹنگ سے محروم ہونے لگے۔

ہارتوش بال نے ہندوستانی سیاست میں معاشی نمائندگی کے بحران کی طرف بھی اشارہ کیا اور کہا کہ پارلیمنٹ کے بیشتر اراکین خوش حال طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس کے باعث عام شہری سیاسی عمل میں پوری طرح نمائندگی حاصل نہیں کر پاتے۔ ان کے مطابق 2014 کے بعد میڈیا کے رویّے میں آنے والی تبدیلی صرف دباؤ کا نتیجہ نہیں بلکہ ملکیت رکھنے والے حلقوں کی نظریاتی وابستگی بھی اس کی ایک اہم وجہ ہے۔

انہوں نے آزاد ڈیجیٹل میڈیا پلیٹ فارموں اور یوٹیوب چینلوں کے ظہور کو ایک مثبت پیش رفت قرار دیا، تاہم یہ بھی کہا کہ ان کے پاس وہ مالی وسائل موجود نہیں جو مستقل زمینی رپورٹنگ کے لیے درکار ہوتے ہیں جبکہ مؤثر صحافت اسی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ انہوں نے خبر رساں ایجنسیوں کے کردار کو بھی غیر معمولی اہم قرار دیا اور کہا کہ اس سطح پر اثر اندازی پورے ملک کے عوامی بیانیے کو تشکیل دے سکتی ہے۔

انہوں نے اس خیال کو بھی مسترد کیا کہ صرف حکومت کی تبدیلی سے میڈیا کی آزادی خود بخود بحال ہو جائے گی۔ ان کے مطابق اپوزیشن جماعتیں بھی اکثر میڈیا کو آزاد ادارہ بنانے کے بجائے اسے اپنے زیرِ اثر رکھنے کی خواہش رکھتی ہیں۔ اختتام پر انہوں نے کہا کہ جمہوری تجدید کے لیے مسلسل عوامی بیداری، فکری وضاحت اور عام لوگوں کے ساتھ مستقل ربط ناگزیر ہے، ورنہ جمہوری زوال کا مؤثر سدباب ممکن نہیں ہوگا۔

جسٹس اقبال انصاری، سابق چیف جسٹس پٹنہ ہائی کورٹ نے 1975 کی ایمرجنسی کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ ایک نوجوان طالبِ قانون کی حیثیت سے وہ ابتدا میں صرف بیرونی ایمرجنسی کے تصور سے واقف تھے مگر بعد میں داخلی ایمرجنسی کے اعلان اور ہزاروں سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریوں کے مشاہدے نے انہیں اس کے عملی اثرات سے روشناس کرایا۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ ایمرجنسی کا رسمی اعلان 1975 میں ہوا تھا لیکن آج ملک ایک ایسی ”غیر اعلانیہ ایمرجنسی“ کے آثار دیکھ رہا ہے جس کی علامت جمہوری اداروں اور آئینی ضمانتوں کی تدریجی کمزوری ہے۔

انہوں نے سپریم کورٹ کے مشہور اے ڈی ایم جبل پور مقدمے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس فیصلے میں ایمرجنسی کے دوران بنیادی حقوق کی معطلی کو تسلیم کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں شہریوں کے لیے عدالتی تحفظ محدود ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس دور کی زیادتیوں کی مثال دیتے ہوئے سینئر وکیل تکم چند کھتری کی گرفتاری کا ذکر کیا، جنہیں محض ایک سیاسی پیش رفت پر مٹھائی اور چائے تقسیم کرنے کے الزام میں داخلی سلامتی کے قانون (میسا) کے تحت حراست میں لیا گیا تھا۔

جسٹس انصاری نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ سپریم کورٹ نے اس مقدمے میں سنگین غلطی کی تاہم، اسی دور میں عدلیہ نے بعض اہم مقدمات میں جرأت مندانہ کردار بھی ادا کیا اور اقتدار کے بعض اقدامات کو محدود کیا۔

موجودہ صورتِ حال سے تقابل کرتے ہوئے انہوں نے عدلیہ کے نسبتاً محتاط رویے پر تشویش ظاہر کی۔ انہوں نے جسٹس ایس مرلی دھر اور جسٹس عقیل قریشی سے متعلق معاملات کو عدالتی آزادی کے کمزور ہونے کی مثالوں کے طور پر پیش کیا۔ انہوں نے انتخابی فہرستوں اور شہریت سے متعلق معاملات میں بھی آئینی اصولوں کے کمزور پڑنے پر تشویش ظاہر کی۔

انہوں نے زور دیا کہ جمہوریت کی بنیاد اختلافِ رائے کے حق پر قائم ہے اور آئینی نظام میں اختلاف ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے مطابق جب عدلیہ آئین کے تحفظ کی اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتی تو ادارے کمزور ہونے لگتے ہیں۔ انہوں نے شہری سماج سے جمہوری اقدار کے تحفظ کے لیے فعال کردار ادا کرنے کی اپیل کی۔

این ڈی پنچولی، سابق صدر پی یو سی ایل دہلی اور نائب صدر سی ایف ڈی نے کہا کہ ہندوستان میں سیاسی جماعتیں بتدریج عوامی مفاد کے بجائے اقتدار اور مفاداتی سیاست کے گرد مرکوز ہوتی جا رہی ہیں۔ انہوں نے مہاتما گاندھی، ایم این رائے اور جے پرکاش نارائن کے خیالات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سیاست پر اخلاقی اور جمہوری نگرانی کے لیے عوامی تنظیموں کا کردار ناگزیر ہے۔

انہوں نے بتایا کہ ستر کی دہائی کے آغاز میں سٹیزنز فار ڈیموکریسی کا قیام جمہوریت، شہری آزادیوں، انسانی حقوق اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے تحفظ کے لیے عمل میں آیا تھا۔ انہوں نے وی ایم ترکندے کے حوالے سے کہا کہ یہ تنظیم ایک ایسے سیاسی واخلاقی بحران کے پس منظر میں وجود میں آئی تھی جس میں بدعنوانی اور جمہوری اقدار کا انحطاط نمایاں تھا۔

ایمرجنسی کے دور کو یاد کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وسیع عوامی تحریک ہی وہ قوت تھی جس نے بالآخر ۱۹۷۷ کے انتخابات کے ذریعے جمہوریت کو بحال کیا۔ تاہم انہوں نے امید ظاہر کی کہ ہندوستان کی طویل جمہوری اور تہذیبی روایت آخرکار آمرانہ رجحانات پر غالب آئے گی اور آنے والی نسلیں آزادی، آئینی اقدار اور جمہوریت کی فتح کا مشاہدہ کریں گی۔

اس پروگرام کی صدارت پروفیسر منورنجن موہنتی نے کی جبکہ پروفیسر اتُل سود، ایڈووکیٹ پونم کوشک، ڈاکٹر مریگانک، ٹریڈ یونین رہنما، اور اشوک کمار بھارتی نے بھی اجتماع سے خطاب کیا۔

تمل ناڈو میں مطالعے کے فروغ کی منفرد کوشش۔۔۔

گریجویٹس گِلڈ وانمباڑی کا اردو وانگریزی کتابوں پر مبنی کامیاب کوئز مقابلہ۔۔۔

(دعوت نیوز ڈیسک)

آج کل عام شکایت ہے کہ نوجوان طبقہ میں کتابیں پڑھنے کا شوق کم ہو گیا ہے لیکن تمل ناڈو کی مردم خیز اردو بستی وانمباڑی میں ایک دلچسپ کوئز مقابلہ نے اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

گریجویٹس گلڈ وانمباڑی (Graduates' Guild Vaniyambadi- GGV) کے زیر اہتمام اردو اور انگریزی کتابوں پر مبنی ایک منفرد آف لائن کوئز مقابلہ منعقد کیا گیا۔

وانمباڑی کے صحافی احسان احمد نے ہفت روزہ دعوت کو بتایا کہ مطالعے کے فروغ اور نوجوان نسل میں کتاب دوستی کا جذبہ بیدار کرنے کے مقصد سے یہ تقریب رکھی گئی۔

آج کے ڈیجیٹل دور میں جہاں نوجوانوں کا رجحان کتابوں سے دور ہوتا جا رہا ہے، وہاں گریجویٹس گلڈ وانمباڑی نے مطالعے کی ثقافت کو فروغ دینے کے لیے ایک منفرد اور بامقصد اقدام کیا۔ اس مقابلے کا مقصد صرف انعامات ہی نہیں بلکہ شرکاء کو مکمل کتابیں پڑھنے، ان میں غور و فکر کرنے اور اپنے علم میں اضافہ کرنے کی ترغیب دینا تھا۔

مقابلے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ تمام سوالات صرف مقررہ کتابوں سے تیار کیے گئے تھے، جس کی وجہ سے بیشتر شرکاء نے متعلقہ کتابوں کا ایک سے زائد مرتبہ مطالعہ کیا تاکہ وہ بہتر انداز میں مقابلے کی تیاری کر سکیں۔ اس طرح یہ مقابلہ حقیقی معنوں میں مطالعے کی تحریک ثابت ہوا۔

۔۔۔اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مقابلہ

یہ مقابلہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چار مختلف زمروں میں منعقد کیا گیا۔ ہر زمرے کے لیے الگ کتاب مقرر کی گئی اور ہر زبان میں انہی کتابوں پر مبنی 100 کثیر الانتخابی (MCQs) سوالات پر مشتمل امتحان منعقد کیا گیا۔

انگریزی زبان کے لیے مقررہ کتب

Category 1 (Grade 5-7): My Journey - Dr. A. P. J. Abdul Kalam
Category 2 (Grade 8–10): The 7 Habits of Highly Effective Teens - Sean Covey
Category 3 (Grade 11–12): Atomic Habits - James Clear
Category 4 (Age 18 and Above): The 7 Habits of Highly Effective People - Stephen R. Covey

اردو زبان کے لیے مقررہ کتب

Category1 (جماعت 5 تا 7): داعیِ اعظم (مولانا محمد یوسف اصلاحی)
Category2 (جماعت 8 تا 10): حیاتِ طیبہ (ابو سلیم محمد عبدالحی)
Category3 (جماعت 11 اور 12): دریتیم (مولانا ماہر القادری)

اسلامیہ بوائز ہائر سیکنڈری اسکول، وانمباڑی (تملناڈو) میں منعقدہ تقریبِ تقسیمِ انعامات میں شہر کی ممتاز شخصیات، والدین اور طلبہ کی پرجوش شرکت، جہاں کامیاب امیدواروں کی حوصلہ افزائی کے لیے انعامات تقسیم کیے گئے۔

Category4 (اوپن زمرہ—ہر ایک شرکت کرسکتا ہے): محمد عربی ﷺ (مولانا عنایت اللہ سبحانی)

نمایاں شرکت

مقابلے میں اردو زبان میں 80 اور انگریزی زبان میں 80 شرکاء نے حصہ لیا۔ یہ امر نہایت خوش آئند رہا کہ شرکاء صرف وانمباڑی تک محدود نہیں تھے بلکہ آمبور، عمر آباد، پرنامبٹ اور تروپاتور سے بھی طلبہ اور شائقینِ مطالعہ نے کوئز میں شرکت کی۔

خصوصی بات یہ رہی کہ اوپن کیٹیگری میں نوجوانوں کے ساتھ ساتھ بزرگوں نے بھی پورے ذوق و شوق کے ساتھ حصہ لیا، جس سے یہ پیغام ملا کہ علم حاصل کرنے اور کتاب پڑھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔

انعامات

ہر کیٹیگری میں درج ذیل انعامات دیے گئے:

پہلا انعام: 3000 روپے
دوسرا انعام: 2000 روپے

اسلامیہ بوائز ہائر سیکنڈری اسکول، وانمباڑی میں گریجویٹس گلڈ وانمباڑی (GGV) کے زیرِ اہتمام کتابوں پر مبنی آف لائن کوئز مقابلے کے دوران شرکاء امتحان میں مصروف۔

تیسرا انعام: 1000 روپے
چوتھے تا آٹھویں مقام: ٹرافی اور سرٹیفکیٹ
نویں تا تیرہویں مقام: میڈل اور سرٹیفکیٹ

اس کے علاوہ مقابلے میں شرکت کرنے والے تمام شرکاء کو شرکت کا سرٹیفکیٹ بھی پیش کیا گیا تاکہ ان کی علمی دلچسپی اور محنت کی حوصلہ افزائی ہو۔

مطالعہ: کامیابی کی بنیاد

کتابیں انسان کی بہترین رہنما ہوتی ہیں۔ وہ نہ صرف علم میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ شخصیت سازی، مثبت سوچ، تنقیدی فکر اور بہتر فیصلہ سازی کی صلاحیت بھی پیدا کرتی ہیں۔ گریجویٹس گلڈ وانمباڑی کی یہ کوشش اسی سوچ کا عملی اظہار ہے کہ نوجوانوں کو صرف امتحانات تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ انہیں معیاری کتابوں کے مستقل مطالعے کی طرف راغب کیا جائے۔

اس پروگرام نے ثابت کیا کہ اگر نوجوانوں کو ایک مثبت اور بامقصد پلیٹ فارم فراہم کیا جائے تو وہ شوق سے کتابیں پڑھتے ہیں، ان پر غور کرتے ہیں اور علمی مقابلوں میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔

تقریب کے اختتام پر مہمانانِ کرام نے گریجویٹس گلڈ وانمباڑی کی اس منفرد علمی کاوش کو سراہتے ہوئے امید ظاہر کی کہ آئندہ بھی اسی نوعیت کے پروگرام منعقد کیے جائیں گے تاکہ معاشرے میں مطالعے کی روایت مزید مضبوط ہو اور نئی نسل علم و تحقیق سے وابستہ ہو سکے۔

اس کی تقریبِ تقسیمِ انعامات بروز اتوار، 28 جون 2026ء اسلامیہ بوائز ہائر سیکنڈری اسکول، قلعہ، وانمباڑی میں منعقد ہوئی۔

اس تقریب میں شہر کی ممتاز علمی، تعلیمی اور سماجی شخصیات نے بطور مہمانانِ خصوصی شرکت کی جبکہ طلبہ، والدین، اساتذہ اور عوام کی بڑی تعداد بھی شامل رہی۔ تقریب میں دو سو سے زائد افراد موجود تھے، جس سے اس پروگرام کی عوامی پذیرائی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مقابلے کا شیڈول

14 جون 2026: اسلامیہ بوائز ہائر سیکنڈری اسکول، وانمباڑی میں آف لائن تحریری امتحان منعقد ہوا۔

21 جون 2026: نتائج کا اعلان کیا گیا۔

28 جون 2026: شاندار تقریب میں کامیاب امیدواروں میں انعامات تقسیم کیے گئے۔

***

دعوت ہفت روزہ نئی دہلی
DAWAT, NEW DELHI
www.dawatnews.net

عالمی کشمکش کے بیچ بھارتی معیشت: خطرات، امکانات اور نئی سمتیں

نوجوانوں کی بڑی آبادی اور وسیع بازار۔ بھارت کی ترقی کا اصل سرمایہ

بڑی منڈی، بڑا خواب۔ کیا بھارت اگلا عالمی مینوفیکچرنگ مرکز بن سکتا ہے؟

ٹیکنالوجی، تجارت اور تعلیم۔ ملک کے مستقبل کی تین بڑی بنیادیں۔ معاشی خود انحصاری سے عالمی قیادت تک۔ بھارت کے لیے فیصلہ کن دور

پروفیسر ظفیر احمد، کولکاتا

ہماری دنیا آج ایسے چوراہے پر کھڑی ہے جہاں سیاست، ٹیکنالوجی، جیوپالٹکس اور معیشت میں آنے والے اتار چڑھاؤ براہِ راست تجارت اور عام لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کر رہے ہیں۔ روس-یوکرین جنگ، مغربی ایشیا میں تناؤ اور تصادم، امریکہ اور چین کے درمیان تجارتی مقابلہ آرائی، توانائی کا بحران، مہنگائی اور عالمی سپلائی چین میں رکاوٹوں نے پوری دنیا کے تجارتی ڈھانچے کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ ایسے وقت میں مصائب محض چیلنج نہیں ہوتے بلکہ مواقع کے دروازے بھی کھولتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باہمی تجارت اور عالمی معیشت کس قدر ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ چین میں پیداوار میں کمی کا اثر امریکہ اور ایشیا کی منڈیوں پر پڑتا ہے، جبکہ مغربی ایشیا میں جنگ کے باعث یورپ اور دیگر خطوں میں پٹرول اور ڈیزل کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں کیونکہ بھارت کے لیے توانائی کے بڑے سپلائر روس اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک ہیں۔ بحری شاہراہوں میں رکاوٹ آنے سے چھوٹے کاروباریوں تک کی لاگت بڑھ جاتی ہے۔ فی الحال آبنائے ہرمز کے بند ہونے یا ایران کے کنٹرول کے خدشات کے سبب مال بردار جہازوں کی آمد و رفت متاثر ہوئی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تجارت اب مقامی نہیں رہی بلکہ کسی نہ کسی صورت عالمی حادثات اور تبدیلیوں سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔

ایسے حالات ہمیں متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔ ایک طرف خام تیل، گیس اور درآمدی اشیا کی قیمتوں میں اضافے سے پیداواری لاگت بڑھی ہے تو دوسری طرف دنیا کی بڑی کمپنیاں چین پر اپنا انحصار کم کر کے ہمارے ملک کی طرف دیکھ رہی ہیں جو ہمارے لیے ایک تاریخی موقع ہے۔ اگر ہم اپنی پیداواری صلاحیت بہتر بنائیں، معیار بلند کریں، لاجسٹکس کو مضبوط کریں اور مینوفیکچرنگ، جو فی الحال تقریباً پندرہ فیصد ہے اسے پچیس فیصد تک لے جانے کی کوشش کریں تو ایک اہم مینوفیکچرنگ ہب اور برآمدات کا مرکز بن سکتے ہیں۔

مگر ہماری تجارت میں سب سے بڑا چیلنج غیر یقینی صورتِ حال ہے۔ روپے کی ڈالر کے مقابلے میں گرتی قدر، خام مال کی قیمتوں میں اضافہ، شرح سود میں اضافہ اور صارفین کی کم ہوتی قوتِ خرید نے تجارتی منصوبہ بندی کو بری طرح سے متاثر کیا ہے۔ ایسے میں محض بڑا کاروبار ہونا کافی نہیں بلکہ لچکدار اور دور اندیش کاروباری حکمتِ عملی بھی ضروری ہے۔ موجودہ عالمی حالات کا سب سے زیادہ اثر چھوٹی اور متوسط صنعتوں پر پڑا ہے۔ خام تیل کی قیمتیں بڑھنے سے حمل و نقل مہنگی ہوئی، بینک قرضوں پر شرح سود بڑھی اور بازار میں مقابلہ آرائی میں اضافہ ہوا۔ ایسے حالات میں چھوٹی صنعتوں کے لیے نقدی کے بہاؤ کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ تاہم ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے اس دور میں نئے مواقع بھی پیدا کیے ہیں۔ آج چھوٹے کاروباری بھی آن لائن پلیٹ فارموں کے ذریعے ملک اور بیرون ملک خریداروں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ای کامرس، سوشل میڈیا مارکیٹنگ اور ڈیجیٹل ادائیگی کے نظام نے تجارت کی ہیئت بدل کر رکھ دی ہے۔

یاد رہے کہ کسی ملک کی خوش حالی کے لیے صرف زمین، مزدور، اثاثے، قدرتی وسائل اور تجارتی شاہراہیں کافی نہیں ہوتیں بلکہ اصل اہمیت اس صلاحیت کی ہوتی ہے جو ان وسائل کو مؤثر انداز میں استعمال کر سکے۔ دولت اور قوت اسی کے پاس جاتی ہے۔ گزشتہ صدی کا صنعتی انقلاب اس کی نمایاں مثال ہے۔ بیسویں صدی میں مالیات، اداروں اور جیوپالٹیکل مواقع کے بہتر استعمال نے کئی ممالک کو ترقی دی مگر اب پہلی بار ٹیکنالوجی معاشی نمو کے اہم ترین عوامل میں شامل ہو گئی ہے۔ امریکہ، چین، جنوبی کوریا، تائیوان اور اسرائیل نے ٹیکنالوجی میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی جس کے نتیجے میں دنیا کی دولت اور اثر و رسوخ کا بڑا حصہ ان کے پاس گیا۔ اس کے برخلاف وہ ممالک جو قدرتی وسائل سے مالا مال تھے مگر ٹیکنالوجی کے استعمال میں پیچھے رہ گئے، ان کی مالی حالت بگڑتی گئی، ترقی رک گئی اور ان کی اسٹریٹجک حیثیت بھی کمزور ہو گئی۔

> اگر بھارت معیارِ پیداوار، مینوفیکچرنگ، لاجسٹکس اور برآمدات کو مضبوط بنائے تو وہ عالمی سپلائی چین میں زیادہ مؤثر اور فیصلہ کن مقام حاصل کر سکتا ہے۔ تاہم یہ سفر صرف معاشی پالیسیوں سے طے نہیں ہوگا بلکہ تعلیم، ٹیکنالوجی، اختراع، ہنرمندی اور صنعتی نظم و ضبط کو قومی ترجیح بنانا ہوگا۔ مصنوعی ذہانت، آٹومیشن اور تحقیق میں سرمایہ کاری کے بغیر آبادی محض تعداد رہتی ہے، معاشی طاقت نہیں بنتی۔ اگر حکومت، صنعت اور تعلیمی نظام مشترکہ دور اندیشی کے ساتھ آگے بڑھیں تو موجودہ عالمی غیر یقینی صورتِ حال بھارت کے لیے ایک نئے معاشی عہد کے آغاز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

دوسری طرف شہریوں کے حالات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کھپت اور معیارِ زندگی اب بھی تشویش ناک حد تک کمزور ہے۔ این ایس ایس کے گھریلو اخراجات کے سروے سے اندازہ ہوتا ہے کہ 2011-12 کے بعد لوگوں کی کھپت میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔ اگرچہ غذائی سبسڈی نے اس سطح کو سہارا دیا ہے مگر ملک کی بڑی آبادی اب بھی معیاری غذا سے محروم ہے۔ اقوامِ متحدہ کے فوڈ اینڈ اگریکلچرل آرگنائزیشن کے اعداد و شمار کے مطابق صحت مند غذا تک رسائی بہت سے لوگوں کے لیے ممکن نہیں ہو پا رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کی بڑی آبادی غذائی تحفظ کے مسئلے سے دوچار ہے۔

دوسری طرف ملک میں بے روزگاری کی شرح بلند ہے اور کم غذائی کھپت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں معیشت کی شرحِ نمو کا فائدہ بڑی آبادی تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ بڑھتی ہوئی معاشی نابرابری ہے۔ ساتھ ہی گزشتہ پانچ برسوں میں حقیقی اجرتوں میں کمی آئی ہے جبکہ مہنگائی، خصوصاً غذائی اشیا کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ بعض ماہرینِ معاشیات کا ماننا ہے کہ ملک میں مزید معاشی اصلاحات کی ضرورت ہے تاکہ بیرونی سرمایہ کار سرمایہ کاری کے لیے آمادہ ہوں۔ ان کی آمد سے زرمبادلہ کے ذخائر میں اضافہ ہو سکتا ہے مگر اربابِ اختیار اس جانب مطلوبہ توجہ دیتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ ملک کا زہر آلود ماحول اور غیر یقینی کیفیت بھی سرمایہ کاروں کو محتاط بنائے ہوئے ہے۔ ہم اکثر روس-یوکرین جنگ اور مغربی ایشیا کے تنازعات کو معیشت کی خرابی کا سبب قرار دیتے ہیں مگر اس کے ساتھ داخلی اصلاحات اور معاشی حکمتِ عملی پر بھی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کی سب سے بڑی طاقت اس کا وسیع گھریلو بازار اور نوجوان آبادی ہے۔ آج بھارتی صارف معیار، برانڈ اور سہولت کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ تبدیلی بھارتی صنعتوں کے لیے ایک مثبت علامت ہے۔ اگر ہم "میک اِن انڈیا" کو بہتر معیار اور مسابقت سے جوڑ دیں تو بھارتی پیداوار دنیا بھر میں مضبوط شناخت قائم کر سکتی ہے۔

موجودہ عالمی تناظر میں توانائی کی سلامتی اور خود انحصاری کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ خام تیل کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ نے واضح کر دیا ہے کہ درآمدات پر حد سے زیادہ انحصار خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمیں متبادل توانائی، برقی گاڑیوں، شمسی توانائی اور سبز صنعتوں کی جانب تیزی سے پیش قدمی کرنی ہوگی۔ یہ محض ماحولیات کی ضرورت نہیں بلکہ معاشی مضبوطی کی بنیاد بھی ہے۔

ادھر ٹیکنالوجی کی دنیا میں بھی غیر معمولی رفتار سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ آٹومیشن، مصنوعی ذہانت اور ڈیٹا پر مبنی فیصلہ سازی تجارت کی ہیئت اور کام کے طریقۂ کار کو تیزی سے بدل رہے ہیں۔ جو ادارے اور افراد نئی ٹیکنالوجی کو اختیار کریں گے وہی آگے بڑھ سکیں گے جبکہ پرانے طریقوں پر اصرار کرنے والوں کے لیے مسابقت مشکل ہوتی جائے گی۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ عالمی بحرانوں سے سماج کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ مہنگائی بڑھنے سے عوام کی قوتِ خرید متاثر ہوتی ہے اور جب صارفین کم خرچ کرتے ہیں تو بازار میں طلب گھٹ جاتی ہے، جس سے کاروبار متاثر ہوتا ہے۔ اسی لیے حکومت کے لیے ضروری ہے کہ روزگار، سرمایہ کاری اور بنیادی ڈھانچے کے فروغ پر توجہ دے۔ حکومت کے "ڈیجیٹل انڈیا"، "پروڈکشن بیسڈ انسینٹو" اور اسٹارٹ اپ پروگرام درست سمت میں قدم ہیں، مگر ان کے اثرات اسی وقت زیادہ مؤثر ہوں گے جب صنعتی دنیا بھی شفافیت، اختراع اور اعلیٰ معیار کو ترجیح دے۔

موجودہ حالات میں ہمارے کاروباریوں کے لیے برآمدات کے وسیع مواقع موجود ہیں۔ عالمی بازار نئے سپلائرز کی تلاش میں ہے۔ فارما، ٹیکسٹائل، انجینئرنگ، فوڈ پروسیسنگ، آئی ٹی خدمات اور آٹو کمپونینٹس جیسے شعبوں میں ہمارے پاس اچھی صلاحیت موجود ہے۔ تاہم ہمیں صرف کم قیمت پر نہیں بلکہ مستقل اور یقینی معیار کے ساتھ مقابلہ کرنا ہوگا۔

اب تجارت صرف منافع کمانے کا ذریعہ نہیں رہی۔ موجودہ حالات نے واضح کر دیا ہے کہ مضبوط سماج اور مضبوط معیشت ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں۔ ملازمین کی مہارت میں اضافہ، مقامی طبقات کی شمولیت، ماحولیات کے تعلق سے ذمہ داری اور اخلاقی تجارتی رویہ اب محض سماجی ذمہ داری نہیں رہے بلکہ طویل مدتی معاشی کامیابی کی کنجی بن چکے ہیں۔

اگرچہ موجودہ حالات میں متعدد چیلنجز موجود ہیں مگر ان کے ساتھ مواقع بھی وابستہ ہیں۔ ہمارے پاس نوجوان قوت، کاروباری صلاحیت، وسیع بازار اور جمہوری استحکام جیسی کئی طاقتیں موجود ہیں۔ اگر ہم اختراع، نظم و ضبط اور خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھیں تو یہ مشکلات ہمارے لیے ایک نئے معاشی دور کا آغاز بن سکتی ہیں۔

اب حکومت بھی کاروباری طبقے کے لیے کئی منصوبوں پر غور کر رہی ہے جن میں کاروباری تحفظ اور سہولتوں کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ اینٹی ڈمپنگ ٹیکس، تحفظاتی اقدامات اور ان شعبوں میں درآمدات کی کڑی نگرانی جہاں سبسیڈی کے اثرات نمایاں ہیں، اہم پالیسی اقدامات ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح گھریلو مسابقت کے لیے لاجسٹکس، بجلی کی مستحکم فراہمی، مہارت کی تربیت، جانچ کی سہولیات، معیارات اور نئی ٹیکنالوجی اختیار کرنے میں حکومتی تعاون مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہ تمام عوامل پیداواری لاگت کو کم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ الیکٹرانکس، سیمی کنڈکٹر، کیمیکل، صاف توانائی کے منصوبوں اور اہم معدنیات کی پروسیسنگ جیسے شعبوں میں مستحکم پالیسی اور مؤثر انتظامیہ، محض سبسیڈی سے کہیں زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔

آج ہمارا ملک ایک متضاد تعلیمی صورتِ حال سے گزر رہا ہے۔ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی نوجوان آبادی اور مصنوعی ذہانت کے شعبے میں امکانات کے ساتھ ہم ایک نئے دور میں داخل ہو رہے ہیں تو دوسری طرف ہماری تعلیمی پالیسی اور نظام اب بھی ایسے افراد تیار کرنے میں مصروف ہے جو سوال اٹھانے کے بجائے جوابات یاد رکھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں جے ای ای، نیٹ، سی یو ای ٹی، یو پی ایس سی اور دیگر مقابلہ جاتی امتحانات کے گرد بننے والے ماحول نے تعلیم کو تقریباً ایک امتحانی صنعت میں تبدیل کر دیا ہے، جبکہ اختراع اور تخلیقی صلاحیت کو مطلوبہ اہمیت نہیں مل رہی ہے۔

آج تحقیق و ترقی میں سرمایہ کاری، اسٹارٹ اپس اور ایم ایس ایم ای کو بہتر طریقے سے سپلائی چین میں شامل کرنا، انجینئرنگ کی مضبوط بنیاد، معیاری نظام اور عالمی منڈی تک رسائی اسی وقت ممکن ہوگی جب ہم اپنی آبادی کے اس ممکنہ فائدے کو معیاری تعلیم، تربیت اور ہنرمندی سے آراستہ کریں گے۔

دعوت کے میدان میں کام کرنے والوں کے مکارم اخلاق

بسلسلہ صفحہ نمبر-17

وارانہ فسادات، ماب لنچنگ کے واقعات، ہر طرح کی محرومیاں، ہندوستان کو ہندو اسٹیٹ بنانے کے ارادے، اسپین کی تاریخ کو دہرانے کے عزائم، تلواروں اور ترشول کی تقسیم اور ببانگِ دہل مسلمانوں کو ختم کر دینے اور ان کا خون بہانے کے اعلانات — یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور مسلمانوں کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ ہم نے کیا غلطی کی ہے اور ہمیں کیا کرنا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے جب مدینہ میں اسلامی ریاست قائم کی تھی تو دنیا کے تمام فرماں رواؤں کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے تھے، لیکن آج کوئی مسلم فرماں روا دنیا کے کسی حکم راں کو اسلام کی دعوت نہیں دیتا۔ اسی لیے اب عالمِ اسلام کی سطح پر مسلمانوں کو سزائیں مل رہی ہیں۔ کبھی مصر، کبھی شام، کبھی لبنان، کبھی لیبیا، کبھی قضیہ فلسطین، کبھی غزہ میں اسرائیل کے ہاتھوں خوفناک خون ریزی کے واقعات — یہ سب اسی لیے پیش آتے ہیں کہ دنیا میں کہیں بھی مسلمان خیرِ امت کے فریضے کو ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ہماری بات آسانی سے اس لیے سمجھ میں نہیں آتی کہ علما یہ بات نہیں بتاتے، لیکن کچھ اللہ والے علما ہیں جنھوں نے یہ بات کہی۔ مولانا علی میاں نے اپنی تقریروں میں کہا تھا کہ اگر مسلمانوں نے برادرانِ وطن تک دینِ اسلام نہیں پہنچایا تو ایک دن یہ ملک اسپین بن جائے گا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی معارف میں یہ بات لکھی تھی کہ اگر اسپین میں مسلمان حکم راں کوئی تعمیری یادگار بھی نہ بناتے، مسجدِ قرطبہ کی تعمیر بھی نہ کرتے لیکن وہ کام کرتے جو مکی زندگی میں کیا گیا تھا یعنی دعوتِ دین کا کام تو مسلمانوں کی حکومت ختم نہ ہوتی۔

یہ امتِ دعوت اگر دعوت کی راہ پر نہیں آئی، اگر اس نے وہ کام نہیں کیا جو ہر پیغمبر نے اپنے زمانے میں انجام دیا تھا، اگر اس نے خیرِ امت کی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کیا تو اس کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اپنے قائدین سے امیدیں مت وابستہ کیجیے، وہ کام کیجیے جو پیغمبر نے کیا اور خیرِ امت کی حیثیت سے مسلمانوں کا منصبی فریضہ ادا کیجیے۔

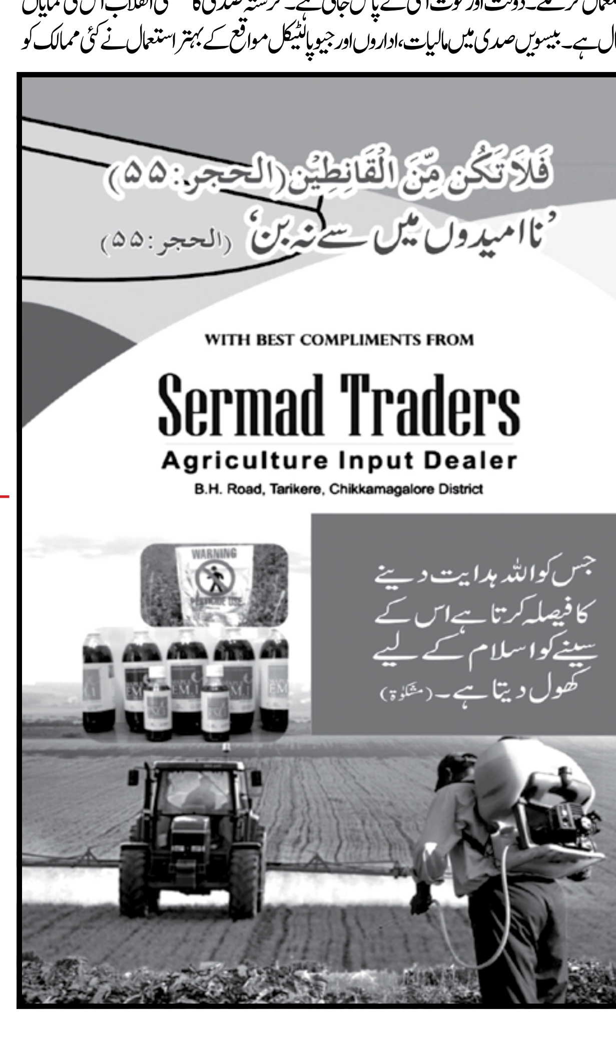

دعوت کے میدان میں کام کرنے والوں کے مکارم اخلاق

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت: مکی دور کے اسوہ کی ضرورت

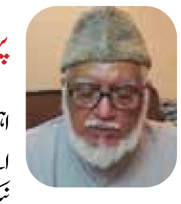

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

اگر ایک شخص دعوت جیسے مقدس اور اہم کام کے لیے میدان میں اترنا چاہتا ہے تو اسے مکارمِ اخلاق سے خود کو آراستہ کرنا ہوگا، نیکیوں کا زیور پہننا ہوگا اور اپنے معاملات اور تعلقات میں دلکشی اور دل آویزی پیدا کرنی ہوگی۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو خطاب کرکے فرماتا ہے کہ اگر تم بد خلق اور سنگ دل ہوتے تو لوگ تم کو چھوڑ کر تم سے بیگانہ ہوجاتے اور دور چلے جاتے:

﴿لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾

(سورۂ آلِ عمران، آیت:159)

اسلام میں اخلاق کی تعلیم پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اجتماعی زندگی گزارنے والوں کو اجتماعی زندگی کے آداب سکھائے گئے ہیں۔ اللہ کے تمام بندوں کی خبر گیری اور غم گساری کا حکم دیا گیا ہے۔ ان احکام کا مطالعہ کیجیے اور ان پر عمل کیجیے تو آپ کے خلاف جو نفرت ہے وہ ختم ہوجائے گی، اور آپ کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی ہیں وہ بھی ختم ہوجائیں گی۔

جس طرح اللہ کا دین عبادت پر ابھارتا ہے اسی طرح اللہ کے بندوں کی غم گساری اور حاجت روائی کی بھی ترغیب دیتا ہے۔ اسلام میں اس بات کی اجازت نہیں کہ انسان خود تو شکم سیر ہوکر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا سوئے۔ اور پڑوسی کے مفہوم میں صرف وہ لوگ شامل نہیں جو آپ کے گھر کے آس پاس رہتے ہیں بلکہ وہ بھی پڑوسی ہیں جو آپ کے ساتھ کام کرتے ہیں، دفتر میں آپ کے ساتھ مصروفِ کار رہتے ہیں، تعلیم گاہ میں آپ کے ہم سبق یا ہم پیشہ ہیں، ٹرین یا گاڑی میں آپ کے ہم سفر ہیں، تجارت اور کاروبار میں شریک ہیں، مسجد میں آپ کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں یا جن کے ساتھ آپ کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ یہ سب قرآن کے مفہومِ جار میں داخل ہیں۔

پھر خدمتِ خلق کا مفہوم بھی بہت وسیع ہے۔ صرف جسمانی، بدنی یا مالی راحت پہنچانا ہی خدمت نہیں بلکہ اللہ کے بندوں کو آخرت کے عذاب اور اللہ کی ناراضی سے بچانا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ اگر آپ نے خدمتِ خلق کے اس وسیع مفہوم کو سمجھ لیا اور اس پر عمل کرنے کا ارادہ کرلیا تو گویا آپ نے بے شمار احادیث پر عمل کرلیا۔

حدیث میں ہے: إِنَّ اللهَ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ، مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد کرتا رہتا ہے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے۔

شخصی اور انفرادی اخلاق کے اجزائے ترکیبی کے مکمل ہونے سے زندگی میں نیکی اور صالحیت کے جو پھول کھلتے ہیں، ان کی خوشبو سے دنیا کے چمن کو معطر ہونا چاہیے اور دنیا میں ہر طرف ایمان کی بہار آنی چاہیے۔ یہ کام دعوت اور حسنِ اخلاق کے ذریعے انجام پا سکتا ہے۔

دنیا کے چمن کو معطر بنانے اور ایمان کی بہار لانے کے لیے حسنِ اخلاق سے خود کو آراستہ کرنا ضروری ہے، لوگوں کے دلوں میں اترنا ضروری ہے اور ان کی راحت رسانی اور خدمتِ خلق کے لیے خود کو وقف کرنا ضروری ہے۔ دعوت کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کو جہنم کی آگ سے بچایا جائے اور اس عظیم الشان کام کے لیے کھڑا ہونے والا شخص خود مجسم اخلاق بن جائے۔

اگر آپ کے اندر اخلاق کی خوشبو نہ ہو اور آپ دلوں کو جیتنے کا ہنر نہ جانتے ہوں تو کون آپ کی بات سنے گا؟ تمام پیغمبر اپنی قوم کو اللہ کے دین کی دعوت دیتے تھے اور ہر پیغمبر حسنِ اخلاق اور خدمتِ خلق کے ذریعے پہلے دلوں کو جیت لیتا تھا۔

آخری پیغمبر حضورِ اکرم ﷺ کے بارے میں قرآنِ کریم کی شہادت ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾

یعنی آپ اخلاق کے بلند مرتبے پر فائز ہیں۔

سب سے پہلے ہم سب کو اپنا مقصدِ زندگی ہر روز، ہر وقت اور ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ ساری خرابی یہ ہے کہ ہمارا جو مقصدِ زندگی ہے، اسے ہم فراموش کرچکے ہیں۔ اگر ہم صرف ایک کام کرلیں کہ ہر روز اپنے مقصدِ زندگی کو یاد کیا کریں تو ہم زندگی میں کامیاب ہوجائیں گے، یعنی با مقصد زندگی گزارنے لگیں گے۔ اور با مقصد زندگی گزارنا ہی حقیقی کامیابی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے زندگی کے مقصد کو جاننا ضروری ہے

قرآنِ مجید میں ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

(سورۂ آلِ عمران، آیت:110)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دوسرا نام دعوتِ اسلام ہے۔ یعنی دعوتِ اسلام تمام مسلمانوں کی زندگی کا مقصد ہے۔ اور جب یہ مقصد معلوم ہوگیا تو یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اس مقصد کے حصول کا راستہ حسنِ اخلاق اور خدمتِ خلق ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، بالفاظِ دیگر دعوتِ اسلام ہے اور دعوتِ اسلام کا ذریعہ اور طریقہ خدمتِ خلق اور حسنِ اخلاق ہے۔

> یہ امتِ دعوت اگر دعوت کی راہ پر نہیں آئی، اگر اس نے وہ کام نہیں کیا جو ہر پیغمبر نے اپنے اپنے زمانے میں انجام دیا تھا اور اگر اس نے خیرِ امت کی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کیا تو اس کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ اپنے قائدین سے امیدیں مت وابستہ کیجیے، وہ کام کیجیے جو پیغمبر نے کیا ہے اور خیرِ امت کی حیثیت سے مسلمانوں کا جو منصبی فریضہ ہے اسے ادا کیجیے۔

قرآنِ مجید کی ایک دوسری آیت ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (سورۂ آلِ عمران، آیت:104)

اس آیت میں خیر کی طرف بلانے کا حکم دیا گیا ہے، یعنی ایک جماعت ہونی چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے۔ اور یہاں خیر سے مراد اسلام لیا گیا ہے؛ اسلام سے بڑھ کر اور کون سا خیر ہوسکتا ہے؟ اسی آیت میں منکر سے روکنے کا بھی حکم دیا گیا ہے اور شرک سے بڑھ کر کوئی دوسرا منکر نہیں پایا جاتا۔

پس اگر توحید کی طرف دعوت دینے والی کوئی جماعت نہ ہو اور شرک سے روکنے کے لیے بھی اللہ کے بندے کھڑے نہ ہوں تو یہ صورت حال عذابِ الٰہی کو دعوت دینے والی بن جاتی ہے۔

سات سو سال مسلمانوں نے ہندوستان میں حکومت کی، اس کے بعد انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ انگریزوں کو نکالنے کی کوشش بنگال میں سراج الدولہ نے کی مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ میسور میں سلطان ٹیپو نے کوشش کی اور شہید ہوئے۔ مسلمانوں کے آخری بادشاہ ظفر کو گرفتار کرکے رنگون بھیج دیا گیا۔ اقتدار اور طاقت کی بازیابی کے لیے مسلمانوں کی چھوٹی بڑی بہت سی کوششیں ناکام ہوئیں۔

جلیانوالہ باغ میں گولیاں چلائی گئیں، ہزاروں افراد مارے گئے، علما کو اور جدوجہد کے لیے کھڑے ہونے والوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ مسلمانوں نے مختلف کوششیں کیں لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکیں۔

جس طرح اسپین میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی، ان کا خون بہایا گیا اور آخر کار انہیں ملک چھوڑنا پڑا، اسی طرح کا انجام یہاں بھی سامنے آسکتا ہے۔

مولانا علی میاںؒ اپنی تقریروں میں کہا کرتے تھے کہ اگر اس ملک میں برادرانِ وطن تک دینِ اسلام نہیں پہنچایا گیا تو ایک دن یہ ملک اسپین کی مثال پیش کرسکتا ہے۔

پچھلے سو سال میں مسلمانوں نے جتنی کوششیں کی ہیں وہ کامیاب نہیں ہوسکیں اور ناکامی ان کا مقدر بنتی گئی۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ توحید کی دعوت دینے والی اور شرک و بت پرستی سے روکنے والی کوئی مؤثر جماعت کھڑی نہ ہوسکی، یعنی ملک میں پیغمبرانہ مشن کو لے کر کوئی منظم جدوجہد سامنے نہ آسکی۔

جس زمانے میں یہ کام نسبتاً آسان تھا، ہم نے اس وقت اس فریضے میں کوتاہی کی۔ مسلم دورِ حکومت میں جبکہ یہ کام زیادہ سہل تھا، ہم نے اس ذمہ داری سے پہلو تہی برتی۔ اور اب جبکہ دشواریاں بڑھ گئی ہیں اور گرفتاریوں کے واقعات سامنے آنے لگے ہیں، ہم یہ کہنے لگے ہیں کہ اب صراحت اور وضاحت کے ساتھ توحید کی دعوت دینے کا زمانہ نہیں رہا، اب قدیم طرزِ عمل ممکن نہیں۔

اور کچھ عرصے بعد شاید یہ کہا جانے لگے — بلکہ بعض لوگ کہنے بھی لگے ہیں — کہ اب دعوت کا زمانہ ہی نہیں رہا، حکومت دعوت برداشت نہیں کرتی، قوانین سخت ہیں، اس لیے بس خود اپنے دین پر عمل کرلیا جائے، یہی کافی ہے۔

بقولِ شاعر:

یہ قدم قدم بلائیں یہ سواد کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کا طریقہ وہی ہوگا جو نبی اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ نے اسلام کے ابتدائی دور میں اختیار کیا تھا۔ قرآنِ مجید میں آتا ہے:

لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ

(سورۂ آلِ عمران، آیت:159)

یعنی اگر آپ سخت مزاج اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب آپ سے دور و نفور ہوجاتے، تمہارے حلقہ بگوش نہ بنتے، نہ اسلام قبول کرتے، نہ صحابی بنتے اور نہ اتنی بڑی تعداد آپ کے ارد گرد جمع ہوتی۔ قرنِ اول میں اسلام کی دعوت کئی طریقوں سے دی گئی۔ اس کا ایک ایک منظر اور ایک ایک واقعہ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ آپ بھی دیکھیے، ایک صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ مکہ میں ذی المجاز کے بازار میں لوگوں کو اسلام کی طرف بلا رہے تھے اور کہہ رہے تھے: يا أيها الناس قولوا لا إله إلا الله تفلحوا۔ اے لوگو! لا الٰہ الا اللہ پڑھ لو، اس طرح تم کامیاب ہوجاؤ گے، تم آخرت کی آنے والی زندگی میں سرخ رو ہوجاؤ گے۔

آپ ہر شخص کو یہی پیغام دے رہے تھے اور لوگ آپ کو مجنون سمجھ کر آپ پر تھوک رہے تھے، خاک ڈال رہے تھے اور گالیاں بھی دے رہے تھے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ہم میں کون ہے جس نے پیغمبر کی اتباع میں دعوت کا کام کیا ہو؟ ہم تو سیرت کے جلسے بھی کرتے ہیں تو برادرانِ وطن، اپنے غیر مسلم بھائیوں کو جلسوں میں نہیں بلاتے۔ ہم نے ان سے تعلقات قائم نہیں کیے، ہم نے سیرت کا لٹریچر ان کو نہیں دیا۔

اب اگر برادرانِ وطن ہمارے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرتے ہیں، ظلم کرتے ہیں، تشدد کا نشانہ بناتے ہیں تو ہم شکایت کرتے ہیں۔ یاد رکھیے، یہ وہ غلطی ہے جس کے ہم صدیوں سے مرتکب ہوتے آرہے ہیں۔ ہم نے ان کو دوزخ کی آگ میں گرنے سے نہیں روکا۔ یہ سزائیں ہیں جو مسلمانوں کو مل رہی ہیں اور ہم آج تک نہیں سمجھ سکے کہ ان آفات اور مصائب کے نزول کا اصل سبب کیا ہے۔

یاد رکھیے، مسلمانوں کی کوئی تنظیم، کوئی جماعت، کوئی امارت، کوئی مشاورت اور کوئی بورڈ مسلمانوں کو ان آفات اور آزمائشوں سے بچا نہیں سکتا۔ مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمہ بھی اسی وجہ سے ہوا۔ انگریزوں کے مظالم دراصل اللہ کی طرف سے وہ سزائیں ہیں جو مسلمانوں کو ملیں۔

ہندوؤں کی طرف سے رات دن مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مسلمان چیخ و پکار کرتے ہیں اور حل یہ بتاتے ہیں کہ مسلمان جدید علوم میں امتیاز حاصل کرلیں، مسلمانوں کے پاس دولت اور خوش حالی آجائے، مسلمان فلاں پارٹی کو مل کر ووٹ دیں۔ مسلمانوں کے لال بجھکڑ یہی سب حل بتاتے رہے ہیں۔

ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ امتِ دعوت اگر دعوت کی راہ پر نہیں آئی، اگر اس نے وہ کام نہیں کیا جو ہر پیغمبر نے اپنے اپنے زمانے میں انجام دیا تھا، اگر اس نے خیرِ امت کی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کیا تو اس کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ اپنے قائدین سے امیدیں مت وابستہ کیجیے، وہ کام کیجیے جو پیغمبر نے کیا ہے اور خیرِ امت کی حیثیت سے مسلمانوں کا جو منصبی فریضہ ہے، اسے ادا کیجیے۔

وہ کام کیجیے جس کا کرنا آپ نے سیکڑوں برس سے چھوڑ دیا ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان میں دعوت کے فریضے سے غفلت اختیار کی، ہندوستان میں مسلمانوں پر اللہ کا عذاب مسلط ہوا، ان کی حکومت ختم ہوئی، آٹھ سو سالہ یا سات سو سالہ دورِ اقتدار کا خاتمہ ہوا اور اس کے بعد سے آج تک آفات اور مظلومیت کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے جو ختم نہیں ہوتا۔

سیکڑوں فسادات ہوئے۔ ۲۰۰۶ء میں حکومت کی طرف سے مقرر کردہ سچر کمیٹی کی رپورٹ سامنے آئی، اس سے اندازہ ہوجائے گا کہ مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا اور کتنی ناانصافیاں ہوئیں۔ یہ ناانصافیاں دراصل وہ سزائیں ہیں جو قدرت کی طرف سے مسلمانوں کو دی گئی ہیں۔

مسلمانوں کا ذہن ادھر منتقل نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کی زبان پر ظلم کا لفظ تو ہزار بار آتا ہے اور شاید آتا رہے گا، لیکن ایک بار بھی ذہن ادھر نہیں جاتا اور نہ جائے گا کہ یہ سب دراصل وہ سزائیں ہیں جو مسلمانوں کو مل رہی ہیں۔

مسلمانوں کا کوئی قائد آپ کو نہیں بتائے گا کہ مسلمانوں نے اپنا دعوتی فریضہ ادا نہیں کیا، جس کی وجہ سے ان کو سزائیں مل رہی ہیں۔ مسلمانوں کی معاشی پسماندگی، مسلمانوں کے خلاف دنگے، فرقہ

بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر 16

ایک اپیل ایک اعلان اور تعارف

آپ کی خصوصی توجہ کا سب سے زیادہ مستحق

مسلم لڑکیوں کا یتیم خانہ گیا

40 سالہ خدمات

THE GAYA MUSLIM GIRLS' ORPHANAGE AT. KOLOWNA, P.O. CHERKI (BIHAR)

لڑکیوں کے لئے جدید اور مکمل اسلامی طرز تعلیم سے مزین قومی سطح کا معیاری رہائشی (Residential) ادارہ

کیفیت قیام ادارہ کا تین (۳) یتیم لڑکیوں سے ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۶ء کو ایک کرایہ کے کھپریل مکان میں قیام عمل میں آیا تھا۔ جو کبھی سانپ، بچھو اور چڑیوں کا بسیرا تھا۔ بقول علامہ اقبالؒ۔ عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کہسار۔

ہندوستان کی ریاست بہار، جھارکھنڈ، بنگال، اڑیسہ (اڈیشہ) میں اپنے طرز کی پہلی اور واحد اقامتی (Residential) دینی وعصری علوم کی مشہور تعلیم گاہ جو اسلامی اور عصری علوم کا سنگم ہونے کی وجہ کر مشہور ہے۔ ادارہ بنیاد کے دن سے ہی صحیح اسلامی خطوط پر یتیم کے ساتھ ساتھ غریب اور غیر یتیم طالبات کی تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہاں کی طالبات کو میٹرک (Matric) پاس کرنے کے بعد کالج کے علاوہ عربی یونیورسیٹی میں سال اوّل و دوم میں بآسانی داخلہ مل جاتا ہے۔ شعبۂ حفظ کی طالبہ کو بھی حفظ کے ساتھ ساتھ میٹرک (Matric) تک پڑھایا جاتا ہے۔ پانچ زبانوں میں مع قرآن واسلامیات اور بہار بورڈ کے نصاب تعلیم کے ساتھ معیاری تعلیم کا نظم ہے۔ تعلیمی سال اپریل تا مارچ ادارہ کے احاطہ (Campus) میں ہی پردہ (Purdah) میں رہ کر درجہ نرسری (Nursery) تا میٹرک (Matric) تک کی تعلیم مع ہوم سائنس (امور خانہ داری) سلائی کٹائی، مہندی و پینٹنگ اور کمپیوٹر کی تعلیم وغیرہ دی جاتی ہے۔ اس لئے بچیوں کو کہیں آنا جانا نہیں پڑتا۔ تعلیمی مراحل ابتدائی ثانوی اعلیٰ شعبہ حفظ تعداد یتیم طالبات 75 نوٹ یتیم طالبات کا سارا خرچ مع طعام و قیام ورہائش وغیرہ بالکل مفت (Free) کسی چیز کا کسی طرح کا کوئی خرچ نہیں لیا جاتا ہے۔ تعداد بیرونی طالبات اپنے خرچ پر دار الاقامہ (Boarding) میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے والی اور دوسرے گاؤں سے پڑھ کر جانے والی تقریباً 100 ہیں۔ کفالہ اسکیم (Sponsorship) کے تحت ایک یتیم بچی کا سالانہ خرچ تیس ہزار (Rs 30,000/=) روپے ہے۔ آپ بھی ایک یتیم بچی کی کفالت کا بار اٹھا کر کار ثواب میں شریک ہوں۔ تعداد اساتذہ ومعلمات اور دیگر ملازمین 30 تدریسی اور غیر تدریسی اسٹاف کی ایک ماہ کی تنخواہ ایک لاکھ اسّی ہزار (Rs1,80,000) روپے سے زائد ہے۔ سالانہ خرچ تقریباً پینتالیس لاکھ (Rs 45,00,000/=) روپے ذریعہ آمدنی مسلم عوام کے چندے اپیل آج کے مادہ پرستانہ اور جدید دور میں لڑکیوں کے لیے جدید اور مکمل اسلامی طرز تعلیم کے ساتھ رہائشی (Residential) اداروں کی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ کر ضرورت ہے۔ آپ اس آسمان چھوتی گرانی کو دیکھتے ہوئے اور ماہ رمضان المبارک کے مبارک موقع پر ادارے کی ننھی منی معصوم یتیم بچیوں کو اونچا اٹھانے کے لیے اپنے زکوٰۃ عطیات صدقات سے بھرپور مالی مدد کریں تاکہ وہ تعلیم اور ہنر کے میدان میں آگے بڑھ سکیں اور کسی سے پیچھے نہ رہیں باقی تعمیری و تعلیمی منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے رقم کی فوری ضرورت ہے ادارہ آپ کے فراخدلانہ اور مخلصانہ بھرپور مالی تعاون کا منتظر ہے۔ یاد رکھیں یہ لڑکیوں کا ادارہ ہے۔ یہاں چندہ وصول کرنے والوں کی بہت کمی ہے۔ یہاں کا کوئی بھی محصل کمیشن (اجرت) پر چندہ وصول نہیں کیا کرتا ہے۔

نوٹ ادارہ کی مختصر تاریخ دستاویزی (Documentary Film) فلم نذر عنایت You Tube (Nazr-e-Enayeth)

چیک وڈرافٹ اورکور بینکنگ سلپ پرصرف یہ لکھیں: THE GAYA MUSLIM GIRLS' ORPHANAGAE

برائے رابطہ چیک وڈرافٹ اور منی آرڈر بھیجنے کا پتہ Founder & Hon. G. Secretary, THE GAYA MUSLIM GIRLS' ORPHANAGE

At: Kolowna, P.o: Cherki-824237, Distt: Gaya (Bihar) India

Email:thegayamuslimgirlsorphanage@gmail.Com Website: www.gmgo.in 8969435151

Beneficiary Name: THE GAYA MUSLIM GIRLS' ORPHANAGE

Bank A/C No.: 300402010007752 (Zakath) زکوٰۃ

Bank A/C No.: 300402010009846 (Donations) عطیات و تعمیرات

Bank IFSC Code No.: UBIN0530042

Bank : UNION BANK OF INDIA (MAIN BRANCH GAYA)

Scan & Pay

نوٹ: بینک میں رقم ٹرانسفر کی تفصیل برائے مہربانی اسکین اینڈ پے (Scan & Pay) یا کسی ذریعہ سے رقم ٹرانسفر کے بعد اسکرین شاٹ (Screen Shot) مع نام و پتہ وہاٹس ایپ نمبر پر وہاٹس ایپ کردیں تاکہ رسید بھیجی جاسکے۔

وہاٹس ایپ نمبر 7367909126 بانی واعزازی جنرل سکریٹری اقبال احمد خاں 9934480190

پٹنہ برانچ آفس پٹنہ شہر کے ہمدردان یتامیٰ اپنا چیک وڈرافٹ اور رقم دینے کے لئے ان سے رابطہ قائم کریں۔

جناب غلام محمد خاں (صدر) سمن پورہ، پٹنہ۔ 9934943229 جناب انجینیر محمد حسنین خاں۔ سمن پورہ، پٹنہ۔ 9631867066

زکوٰۃ اور عطیات وغیرہ کی رقم جمع کرنے کے لئے گیا شہر میں بنائے گئے مراکز (Center)

(1) شکیل احمد صاحب: ممبئی اسٹور، بزازہ روڈ، چھتہ مسجد گیا۔ (2) ڈاکٹر امیر الدین خاں صاحب: بھارت ہومیو اسٹور، اے این روڈ، گیا۔ (3) ڈاکٹر بی۔ اے خاں صاحب: نزد ریلوے کوارٹر، گیا۔ (4) ڈاکٹر تنویر صاحب: ملت اسپتال، گیا۔ (5) ڈاکٹر زیڈ۔ ایچ خاں صاحب: وہائٹ ہاوس کمپاؤنڈ، گیا۔ (6) منصور صاحب: کارڈ سنٹر، معروف گنج، گیا۔

قرآن کی روشنی میں ایمان کی تین منزلیں

علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین

ڈاکٹر ساجد عباسی، حیدر آباد

ایمان محض ایک عقیدہ یا زبانی اقرار کا نام نہیں بلکہ ایسا یقین ہے جو انسان کے دل، عقل، جذبات اور عمل میں رچ بس جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں بار بار غور و فکر، تدبر اور مشاہدہ کائنات کی دعوت دی گئی ہے تاکہ انسان کا ایمان یقین کے اعلیٰ درجات تک پہنچ جائے۔ قرآن میں یقین کے تین درجے بیان کیے گئے ہیں: علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔

۱۔ علم الیقین: علم الیقین سے مراد ایسا یقین ہے جو صحیح علم، دلائل اور خبر صادق کے ذریعے حاصل ہو۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ (سورۃ التکاثر:۵) "ہرگز نہیں! اگر تم علم الیقین کے ساتھ جان لیتے" علم الیقین سے مراد وہ علم ہے جو مشاہدہ یا تجربے سے قبل دلائل کی بنیاد پر حاصل ہو۔ فرض کیجیے کہ کسی شخص نے کبھی آگ نہیں دیکھی لیکن ایک قابلِ اعتماد شخص اسے بتاتا ہے کہ آگ جلانے والی چیز ہے۔ وہ دلائل اور شہادتوں کی بنیاد پر یقین کر لیتا ہے کہ آگ موجود ہے اور جلانے والی ہے۔ یہ علم الیقین ہے۔ ہم نے جنت، جہنم، فرشتوں، عرش، حساب، میزان اور آخرت کو نہیں دیکھا لیکن قرآن میں اللہ تعالیٰ نے عالمِ آخرت کے بارے میں جو پر زور دلائل پیش کیے ہیں ان کی بنیاد پر ان پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اللہ کے رسول ﷺ نے تفصیل سے آخرت کے احوال کو بتلایا تو ہمارے ایمان بالآخرت میں اور اضافہ ہوا۔ دلائل کی بنیاد پر جب ہم کو یہ یقین ہوتا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں تو ہم قرآن کے علم کو علم الیقین کے طور پر مان لیتے ہیں۔ جو علم قرآن سے حاصل ہوتا ہے وہ بھی دلائل اور معقولیت کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے اسی لیے تاکید کی گئی ہے کہ قرآن میں تدبّر کیا جائے (سورۃ النساء:۸۲، سورۃ محمد:۲۴) جتنا قرآن کی آیات میں تدبّر کیا جائے گا اسی قدر علم الیقین بھی بڑھے گا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ قرآن میں توحید، آخرت اور رسالت کے پرزور دلائل جیسے جیسے ہم پڑھتے اور سمجھتے جائیں گے اسی قدر ہمارا علم الیقین بڑھتا جائے گا۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ جب قرآن کو سمجھ کر پڑھا جائے گا تو ایمان بڑھے گا (سورۃ الانفال:۲) انسان اور حیوان کا امتیازی فرق عقل کا ہے۔ حیوان ان چیزوں کا ہی ادراک کرتے ہیں جو ان کے حواس کی گرفت میں آتے ہیں جبکہ انسان کی شانِ امتیازی یہ ہے کہ وہ نشانیوں کو دیکھ کر عالم الغیب کے حقائق کا ادراک کرتا ہے اور جب ان حقائق کے دلائل ہدایت کی روشنی بن کر سلیم الفطرت انسان کے سامنے آتے ہیں تو وہ علم الیقین کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے سب سے پہلا امتحان عقل کا امتحان ہے کہ آیا ایک انسان حیوان کی سطح پر جیتے ہوئے محض خواہشاتِ نفس کو پورا کرنے کو مقصدِ زندگی بناتا ہے یا وہ کائنات کے بنیادی سوالات کا جوابات پانے کی کوشش کرتا ہے کہ کس نے یہ کائنات بنائی اور کس مقصد کے لیے بنائی؟ جو ان دونوں سوالات کے جوابات کو پانے کی کوشش کرے گا وہ بالآخر اپنے خالق کو دریافت کرے گا۔ اسی سے شعوری ایمان حاصل ہوتا ہے۔

درحقیقت سائنس میں بے شمار ایسی حقیقتیں تسلیم کی جاتی ہیں جو براہِ راست حواسِ خمسہ کی گرفت میں نہیں آتیں بلکہ ان کے آثار، نتائج اور عقلی و تجرباتی شواہد کی بنیاد پر ان کے وجود کو مانا جاتا ہے۔ مثلاً الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران کو کسی انسان نے اپنی آنکھ سے براہِ راست نہیں دیکھا۔ ہم اس کے وجود کو اس کے اثرات، برقی رو، ایٹمی تجربات اور جدید آلات کے ذریعے جانتے ہیں۔ فوٹون (Photon) روشنی کے بنیادی ذرّات ہیں۔ ہم فوٹون کو براہِ راست نہیں دیکھتے بلکہ اس کے اثرات کو دیکھتے ہیں۔ حقیقت میں ہم روشنی کے ذریعے اشیاء کو دیکھتے ہیں، خود فوٹون کو نہیں۔ کششِ ثقل (Gravity) کو نہ دیکھا جا سکتا ہے اور نہ چھوا جا سکتا ہے۔ ہم صرف اس کے اثرات دیکھتے ہیں، مثلاً سیب کا زمین پر گرنا، سیاروں کی گردش اور کہکشاؤں کی حرکت۔ مقناطیسی میدان (Magnetic Field) بذاتِ خود نظر نہیں آتا لیکن لوہے کے برادے کی ترتیب اور مقناطیس کی کشش اس کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ برقی میدان (Electric Field) کو بھی کوئی براہِ راست محسوس نہیں کرتا مگر اس کے اثرات کی بنا پر سائنس اس کے وجود کو تسلیم کرتی ہے۔ جدید فلکیات کے مطابق کائنات کا ایک بڑا حصہ ڈارک میٹر (Dark Matter) پر مشتمل ہے۔ آج تک کسی نے اسے براہِ راست نہیں دیکھا لیکن کہکشاؤں کی حرکات اس کے وجود کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کائنات کے پھیلاؤ کی رفتار میں اضافے کی وضاحت کے لیے سائنس داں ڈارک انرجی (Dark Energy) کا تصور پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی براہِ راست مشاہدے میں نہیں آئی۔ پروٹان اور نیوٹران کے اندر موجود کوارکس (Quarks) کو الگ کر کے کبھی براہِ راست نہیں دیکھا گیا لیکن ان کے وجود کے حق میں مضبوط نظریاتی اور تجرباتی شواہد موجود ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سائنس صرف ان چیزوں کو مانتی ہے جو حواس کی گرفت میں آئیں حالانکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ سائنس مشاہدہ (Observation) اور تجربہ (Experiment) کے علاوہ استدلال (Inference) سے بھی کام لیتی ہے۔ بہت سے سائنسی حقائق کو پہلے عقلی استدلال سے تسلیم کیا گیا اور بعد میں تجربات نے ان کی تائید کی۔ مثلاً سیارہ نیپچون کی موجودگی پہلے ریاضیاتی حسابات سے معلوم ہوئی، بعد میں اسے دیکھا گیا۔ پوزیٹرون (Positron) کا وجود پہلے نظریاتی طور پر پیش کیا گیا پھر اس کی دریافت ہوئی۔ ہگز بوزون (HiggsBoson) کو کئی دہائیوں تک صرف نظریاتی بنیادوں پر مانا جاتا رہا لیکن بعد میں اس کے وجود کو تسلیم کیا گیا۔ اسی طرح خالقِ کائنات کو بھی استدلال سے مانا جانا چاہیے۔ اس کے بعد ایک وقت آئے گا جب اس کا دیدار بھی نصیب ہوگا۔ چنانچہ یہ اصول کہ "جو چیز نظر نہ آئے، وہ موجود نہیں" خود سائنسی اعتبار سے بھی درست نہیں ہے۔ اس معیار کے مطابق تو شعور (Consciousness) کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ہم اپنے شعور اور ارادے کو بھی راست طور پر نہیں دیکھ سکتے مگر ان کے وجود میں شک نہیں کرتے۔ خالقِ کائنات کے وجود کا استدلال بھی اسی اصول پر قائم ہے کہ اثر (effect) کسی مؤثر (Cause) کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کتاب

مصنف کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ عمارت معمار کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ قانون قانون ساز کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اسی طرح جب کائنات میں نظم پایا جاتا ہے تو یہ نظم ایک ناظم کی طرف اشارہ کرتا ہے اور تخلیق خالق کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ نتیجہ براہِ راست مشاہدے پر نہیں بلکہ عقلی استدلال سے حاصل ہوتا ہے۔ کیا انسان کی محدود عقل لا محدود ہستی کا احاطہ کر سکتی ہے؟ قرآن کہتا ہے: وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا (سورۃ طٰہٰ:۱۱۰) "وہ اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے" انسان ابھی تک پوری کائنات کے ایک معمولی سے حصے کا بھی احاطہ نہیں کر سکا ہے۔ قابلِ مشاہدہ کائنات ہی تقریباً ۹۳ ارب نوری سال قطر پر مشتمل سمجھی جاتی ہے، جبکہ اس سے آگے کیا ہے، اس کا علم ابھی انسان کے پاس نہیں ہے۔ جب مخلوق اپنی پوری کائنات کا مکمل ادراک نہیں کر سکی تو خالقِ کائنات کے بارے میں یہ شرط لگانا کہ 'میں اسے آنکھ سے دیکھوں تبھی مانوں گا' خود ایک غیر منطقی و غیر عقلی مطالبہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ آنکھیں محدود ہیں، ان کی پہنچ محدود طولِ موج تک ہے۔ ہم نہ ریڈیو لہریں دیکھ سکتے ہیں، نہ ایکس ریز، نہ گاما شعاعیں؛ حالانکہ وہ موجود ہیں۔ آنکھوں سے دیکھ کر ماننا حیوانات کی صفت ہے۔ انسان کو عقل دی گئی ہے تاکہ وہ عقلی استدلال سے غیبی حقائق کو مانے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (سورۃ البقرۃ:۳) "جو غیب پر ایمان لاتے ہیں" قرآن سے ہدایت پانے والوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ متقی ہوتے ہیں اور ان کی پہلی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ محسوسات کی دنیا سے اوپر اٹھ کر اللہ کی نشانیوں میں غور و فکر کر کے عالم الغیب کے حقائق کو جان کر ان پر ایمان لاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خالقِ کائنات کی دریافت کے لیے مظاہرِ کائنات پر غور کیا۔ ستاروں چاند اور سورج کے بارے میں جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ خود ایک حساب اور ضابطے کے پابند ہیں تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کا خالق وہ ہے جس کے آگے چاند اور سورج اور تارے سرِ اطاعت خم کیے ہوئے چل رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اعلان کیا کہ ان کا رب وہ ہے جس نے زمین و آسمانوں کو پیدا فرمایا ہے۔ (سورۃ الانعام:۷۹) علم الیقین سے مراد ایسا علم ہے جو عقلی استدلال سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی علم سے انسان ایمان و یقین کے پہلے درجے تک پہنچتا ہے۔

۲۔ عین الیقین: عین الیقین وہ ہے جو مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام علم الیقین کے حصول کے بعد یقین کی اگلی منزلوں پر پہنچنا چاہتے تھے۔ یعنی وہ علم الیقین سے عین الیقین کی منزل میں قدم رکھنا چاہتے تھے۔ قرآن نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے: "جب ابراہیم نے کہا تھا کہ "میرے مالک! مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ فرمایا: "کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟" اس نے عرض کیا "ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے" فرمایا: "اچھا، تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے۔ پھر ان کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار، وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لو کہ اللہ نہایت با اقتدار اور حکیم ہے" (سورۃ البقرۃ:۲۶۰) یہ علم الیقین سے عین الیقین کی طرف سفر تھا۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ (سورۃ التکاثر:۷) "پھر تم اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لوگے" اس آیت میں فرمایا جا رہا ہے کہ عالمِ آخرت میں جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے سے قبل جہنم کی آگ کو علم الیقین کی سطح پر جان لو اور اس آگ سے بچنے کی تیاری کرو۔ جب آنکھ سے کوئی چیز دیکھی جاتی ہے تو جھٹلائی نہیں جا سکتی (سورۃ الواقعہ:۲) جب انسان جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا تو اس کو عین الیقن ہو جائے گا لیکن اس وقت ماننے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کو شبِ معراج میں جنت، جہنم، ملائکہ اور آسمانی حقائق کا مشاہدہ کروایا گیا۔ قرآن فرماتا ہے: لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ (سورۃ النجم:۱۸) "بے شک اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں" یہ عین الیقین کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ بنی اسرائیل نے سمندر کو پھٹتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر فرعون کو غرق ہوتے ہوئے دیکھا۔ یہ اللہ کی نصرت کا عین الیقین تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء اور رسولوں کو ایسی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ وہ یقین کے اعلیٰ مقام پر پہنچیں۔ وہ عین الیقین کی زمین پر کھڑے ہو کر اپنی قوم کو اپنے رب کی طرف دعوت دیتے ہیں تاکہ ان کی دعوت پُر زور اور پُر اثر ہو۔ دعوت یقین اور انتہائی خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ ہو کہ کہیں یہ قوم حق کو جھٹلانے کے نتیجے میں جہنم کی مستحق نہ بن جائے۔

۳۔ حق الیقین: یہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایمان مشاہدہ سے آگے بڑھ کر عملی تجربہ بن جائے۔ یہ یقین کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے جس کو قرآن مجید اس طرح بیان فرماتا ہے: إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ (سورۃ الواقعہ:۹۵) "بے شک یہ سراسر حق الیقین ہے" حق الیقین وہ یقین ہے جو ذاتی تجربہ اور عملی احساس بن جائے۔ مثال کے طور پر کسی نے آگ کے بارے میں سنا اور دلائل سے مانا تو یہ علم الیقین ہے۔ اس نے آگ کو دیکھا تو یہ عین الیقین ہے۔ اگر آگ کی حرارت کو خود محسوس کیا تو یہ حق الیقین ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب کائنات میں غور و فکر کیا تو ان کو علم الیقین حاصل ہوا کہ اللہ ہی اس کائنات کا حقیقی رب اور معبود ہے۔ جب آپ کی آنکھوں کے سامنے پرندوں کو زندہ کیا گیا تو آپ کو عین الیقین حاصل ہوا۔ اور جب نمرود نے آپ کو آگ میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ (سورۃ الأنبیاء:۶۹) "اے آگ! ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا" اس واقعہ میں ابراہیمؑ نے اللہ کی قدرت کو نہ صرف دیکھا بلکہ اس کا عملی تجربہ بھی کیا۔ اس کے بعد جو یقین کی دولت نصیب ہوتی ہے اس کو حق الیقین کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے گلے پر چھری چلا دی اور جب پٹی کھول کر دیکھا تو اپنے بیٹے کو زندہ کھڑا ہوا پایا اور بیٹے کی جگہ پر دنبہ ذبح کیا گیا تھا۔ اس طرح باپ اور بیٹے نے اللہ کی قدرت اور رحمت کا تجربہ کیا۔ یہ ایسا ایمانی تجربہ تھا جو حق الیقین کی اعلیٰ مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے موقع پر فرمایا: فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (سورۃ الصافات:۱۰۳ تا ۱۰۵) "آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا۔ اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں"

ہجرت کے موقع پر کفار مکہ غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ کہنے لگے "اگر ان میں سے کوئی اپنے قدموں کے نیچے دیکھ لے تو ہمیں دیکھ لے گا" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (سورۃ التوبہ:۴۰) "غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے" یہ اللہ کی معیت کا زندہ تجربہ تھا۔ یہ حق الیقین کی کیفیت تھی۔ میدانِ بدر میں مسلمان تعداد میں صرف ۳۱۳ تھے اور سامنے ایک ہزار کا لشکر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتے نازل فرمائے اور مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔ قرآن فرماتا ہے: وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (سورۃ الأنفال:۱۰) "مدد تو صرف اللہ ہی کی طرف سے آتی ہے" صحابہ کرامؓ نے اللہ کی نصرت کو عملی طور پر محسوس کیا۔ یہ حق الیقین تھا۔

یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ اپنے قاری کے ایمان کو تینوں درجات تک پہنچاتا ہے۔ قرآن اپنی آیات کے ذریعے اہلِ ایمان کے دل میں علم الیقین پیدا کرتا ہے۔ قرآنی آیات میں توحید، رسالت اور آخرت کے ناقابلِ تردید دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ آسمان و زمین کی تخلیق، سورج و چاند کا نظام، انسانی پیدائش، نباتات اور حیوانات کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی خلاقی اور حکمت کے پہلوؤں کو پیش کیا گیا تاکہ عقل مطمئن ہو جائے۔ عقل جب مطمئن ہو جاتی ہے تو علم الیقین پیدا ہوتا ہے۔ قرآن جنت اور جہنم کے مناظر اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ گویا قاری انہیں دیکھ رہا ہو۔ یہ کیفیت اس کے اندر عین الیقین پیدا کرتی ہے اور جب بندہ قرآن کی تعلیمات پر عمل کرتا ہے، دعا کرتا ہے، عبادت کرتا ہے، گناہوں سے بچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسے ایمانی تجربات سے گزاتا ہے جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اس کے قرب کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں ایمان و یقین تجربہ بن جاتا ہے۔ یہ حق الیقین ہے۔

موت ایسی حقیقت ہے جو ہمیں کامل یقین سے روبرو کروا دیتی ہے۔ موت جب آتی ہے تو غیب کے سارے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ انسان اس وقت عالم الغیب میں داخل ہوتا ہے جہاں وہ سب سے پہلے موت کے فرشتے کو دیکھتا ہے۔ اس وقت اس پر پوشیدہ حقائق ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ انسان عین الیقین (موت) سے پہلے علم الیقین حاصل کر لے اور اس علم کی بنیاد پر خدا ترسی کی زندگی گزار کر موت کے دروازے سے دوسرے عالم میں قدم رکھے جہاں اسے کوئی حیرت و استعجاب نہ ہوگا بلکہ وہ ہر منزل سے مانوس ہوگا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ (سورۃ الحجر:۹۹) "اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ تمہیں یقین (موت) آجائے" اس آیت میں موت کو یقین کہا گیا ہے، اس لیے کہ موت ایک ایسا امرِ یقینی ہے جس کو دنیا کا کوئی بھی انسان جھٹلا نہیں سکتا۔ زندگی غیر یقینی ہے کہ کسی وقت بھی اور کسی مقام پر بھی زندگی کی شام ہو سکتی ہے لیکن موت یقینی ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔

آیئے دیکھیں کہ جلیل القدر صحابہ کے دلوں میں ایمان و یقین کس قدر بلند تھا۔ حضرت بلالؓ کو مکہ کی تپتی ریت پر لٹایا جاتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھے جاتے مگر ان کی زبان پر صرف ایک صدا ہوتی: "اَحد، اَحد"۔ یہ محض علمی ایمان نہ تھا بلکہ ایسا یقین تھا جو روح میں اتر چکا تھا۔ یہی حق الیقین تھا۔ حضرت خبیب بن عدیؓ کو جب سولی پر چڑھایا گیا تو مشرکین نے پوچھا: "کیا تم چاہتے ہو کہ محمد (ﷺ) تمہاری جگہ ہوں؟" انہوں نے جواب دیا: "اللہ کی قسم! میں یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ محمد ﷺ کے پاؤں میں کانٹا چبھے اور میں اپنے گھر میں محفوظ بیٹھا رہوں" ایسی محبت حق الیقین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ حضرت سمیہؓ اسلام کی پہلی شہید خاتون شدید اذیتوں کے باوجود ایمان پر ثابت قدم رہیں۔ یہ یقین کا وہ مقام تھا جہاں دنیا کی تکلیف آخرت کی حقیقت کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہے۔

غزوہ احزاب میں خندق کھودتے وقت ایک چٹان سامنے آئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ضرب لگائی اور فرمایا: "مجھے شام کی کنجیاں دی گئیں"

بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر 8

باہمی تعاون: وحدتِ امت کی روح

اسلامی اخلاقیات اور اجتماعی ذمہ داری کے تصور کو اجاگر کرنے والی کتاب

نام کتاب: باہمی تعاون: وحدت امت کی روح
مصنف: محمد صادر ندوی (رفیق ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، علی گڑھ)
صفحات: ۱۶۰
قیمت: ۱۲۰ روپے
ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی
اشاعت: فروری ۲۰۲۶ء
مبصر: انوار عالم (اسکالر ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، علی گڑھ)

باہمی محبت و تعاون اسلامی اخلاقیات کے بنیادی عناصر میں سے ہیں۔ باہمی تعاون کے بغیر ایسا صالح معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا جس میں لوگ بے لوث خدمات انجام دیں، ایک دوسرے کی خبر گیری کریں، بیواؤں اور بے کسوں کی دادرسی کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى ”جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو“ (المائدۃ: 2)

یہ محض ایک اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر سماجی اصول ہے جو فرد، خاندان، معاشرہ اور ریاست؛ سب کی ساخت کو منظم کرتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں تعاون کا مفہوم صرف وقتی امداد یا مادی اشتراک تک محدود نہیں رہتا بلکہ فکری ہم آہنگی، اخلاقی اقدار، سماجی ذمے داری اور تمدنی اشتراک تک وسیع ہو جاتا ہے۔ باہمی تعاون سے معاشرے میں امن، استحکام اور بھائی چارے کی فضا قائم ہوتی ہے۔ جب افراد ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں اور ضرورت کے وقت مدد فراہم کرتے ہیں تو معاشرتی روابط مضبوط ہوتے ہیں اور اجتماعی مسائل کے حل میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح تعاون کا جذبہ معاشی، تعلیمی اور سماجی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ زیر نظر کتاب ”باہمی تعاون: وحدت امت کی روح“ اسی موضوع سے متعلق ہے۔ مصنف مولانا محمد صادر ندوی ہیں، اس وقت وہ ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، علی گڑھ میں رفیق کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ کتاب اسی ادارے کے تصنیفی پروجیکٹ کا حصہ ہے۔ اس سے قبل ان کی دو کتابیں ”مکالمہ بین المذاہب: موجودہ صورت حال اور مطلوبہ موقف“ اور ”قرآن مجید کی مقاصدی تفسیر: ایک نئی فکری جہت“ (ترجمہ) منظر عام پر آچکی ہیں۔ مختلف رسائل و جرائد میں ان کے تحقیقی مقالات اور مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

یہ کتاب پیش لفظ کے علاوہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کے تحت متعدد فصلیں ہیں جن کا تعارف ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ باب اول ”مسلمانوں کے درمیان باہمی تعاون: ضرورت اور اقسام“ کے عنوان سے ہے، اس باب کو دو فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فصل اول: مسلمانوں کے درمیان باہمی تعاون: دینی اور شرعی فریضہ۔ اور فصل دوم: تعاون کی قسمیں۔

فصل اول میں باہمی تعاون کی اہمیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں قرآنی آیات ”اخرجت للناس“ اور ”بنیان مرصوص“ کے تحت نفع رسانی اور خیر سگالی کو اس امت کے مقصدِ وجود کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہ امت جہاں بھی رہے گی بارانِ رحمت کی مانند دوسروں کو فیض پہنچاتی رہے گی۔ نیز، امت کے ہر فرد سے مطالبہ ہے کہ زندگی کے تمام گوشوں میں اخوت و محبت، اعتماد، باہمی تعاون اور اشتراک عمل کا ایک خوبصورت نظارہ پیش کرے جو امتِ واحدہ کے تصور کا عملی ترجمان ہو۔

عصری علوم کے ماہرین کے حوالے سے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ ماہرین سماجیات و بشریات اس بات پر متفق ہے کہ کوئی بھی کمیونٹی یا سماجی گروہ اس وقت تک خارجی دنیا سے اپنے تعلقات استوار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک خود اس گروہ کے افراد کے باہمی روابط مضبوط نہ ہوں، کیوں کہ کسی عمل کا ٹھوس نتیجہ، دیرپا اور نفع بخش صورت میں اسی وقت سامنے آتا ہے جب متنوع صلاحیتیں یکجا ہو کر کسی مشترک مقصد میں صرف ہوتی ہیں۔

اس فصل میں ’باہمی تعاون قرآنی حکم‘، ’خیر کے کاموں میں تمام مسلمانوں سے تعاون مطلوب ہے‘، ’مسلمانوں کے درمیان باہمی تعاون‘ اور ’باہمی تعاون کے نبوی احکام‘ کے عنوان کے تحت بحث کی گئی ہے۔

دوسری فصل میں تعاون کی دو قسمیں: اوّل: برّ اور تقویٰ میں تعاون، دوم: گناہ کے کاموں میں تعاون سے احتراز پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں امام ابن تیمیہؒ، علامہ عینیؒ اور امام قرطبیؒ کے حوالے سے دونوں قسموں پر مختصر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

قرن اول کو باہمی تعاون کی مثالی معاشرے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور اس صدی کے تین واقعات: ۱۔ مواخات، ۲۔ قبیلہ اشعر میں باہمی تعاون کا جذبہ، ۳۔ حضرت عمر فاروقؓ کا اپنے دینی بھائی حضرت اوس بن خولیؓ سے رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں باری باری حاضری پر اتفاق کو بہ طور مثال پیش کیا گیا ہے۔

مواخات کا سب سے بڑا مقصد مسلمانوں کے درمیان وحدت کا تصور، اجتماعیت کی روح اور باہمی تعاون کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔

باہمی تعاون جیسے اہم معاشرتی فریضہ کی معنویت کے پیش نظر یہ بات بھی بیان کی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لیے مختلف تنظیموں اور اداروں کا قیام عمل میں آنا چاہیے۔ اس سلسلے میں مشہور مفسر و مفکر علامہ رشید رضا کی رائے کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے جن کے مطابق اجتماعی ادارے مسلمانوں کی فلاح اور اتحاد میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

باب دوم ”باہمی تعاون کی صورتیں“ کے عنوان سے ہے، اس میں تعاونِ باہمی کے چار اہم میدانوں: ۱۔ تعلیمی میدان، ۲۔ معاشی میدان، ۳۔ حقوق کے تحفظ کی کوششیں، ۴۔ سیاسی ترقی کو چار فصلوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کی روشنی میں ہندوستانی مسلمانوں کی صورت حال کو قیاس آرائی سے بیان کرنے کے بجائے سرکاری رپورٹس، ریسرچز، ان میدان کے ماہرین اور اعداد و شمار کی روشنی میں حقیقت پسندانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ پسماندگی کے اسباب اور اس زبوں حالی کو دور کرنے کے لیے عملی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

فصل اول ”تعلیمی میدان میں باہمی تعاون“ کے ضمن میں انسانی زندگی سے تعلیم کی گہری وابستگی اور نوعِ انسانی کے عروج و ترقی میں تعلیم کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مسلمانوں کی صورت حال کو بدلنے کے لیے قومی خواندگی مشن میں شرکت، عوامی فلاح کے پروگراموں سے واقفیت اور ان سے استفادہ، تعلیمی بیداری مہم، علاقائی سطح پر تعلیمی انجمن کا قیام، فاصلاتی اور آن لائن نظامِ تعلیم سے استفادہ اور اقتصادی پوزیشن کو مضبوط کرنے کی ضرورت جیسے عناوین کے تحت قدر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

فصل دوم ”معاشی میدان میں باہمی تعاون“ کی ابتدا میں معاشی قوت کا بین الاقوامی سیاست میں اس کے رول اور عالمی فیصلہ میں اس کے مؤثر کردار کی وضاحت کے ساتھ معاش کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ انحطاط کی موجودہ صورت حال میں مسلمانوں کی پوزیشن، ملازمت میں مذہب کی بنیاد پر امتیازی سلوک جیسے اہم نکات پر مختلف ریسرز اور رپورٹوں کے اعداد و شمار کی روشنی میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے، نیز مسلمانوں کو اس اقتصادی اور معاشی صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے باہمی تعاون کی مختلف شکلیں پیش کی گئی ہیں: ’معاشی قوت کے لیے جہدِ مسلسل کی ترغیب‘، ’تعطل پسند افراد میں جذبہ عمل کی بیداری‘، ’بیداری کے طریقے‘، ’سماجی کارکنان کا موثر کردار‘ اور ’خود مختار ذرائع معاش کو فروغ دینے کی ضرورت‘ جیسے اہم امور پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اس سے متعلق متعدد مفکرین کے حوالہ جات بھی پیش کیے گئے ہیں۔

فصل سوم ”بنیادی حقوق کے تحفظ میں باہمی تعاون“ کے تحت تعلیم گاہوں اور مکاتب و مدارس کے سلسلے میں موجود حکومتی پالیسیوں کو ایک بڑے چیلنج کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ملک کو بھگوا رنگ میں رنگنے کی کوشش کو مصنف نے اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے اپنے دین و ایمان اور ثقافتی ورثے کی حفاظت میں اہم چیلنج قرار دیا ہے۔

حقوق کے تحفظ کے لیے اجتماعی جدوجہد، مظلوم مسلمانوں کا تعاون، قانونی اقدامات، سماجی و سیاسی پلیٹ فارموں کا استعمال، سیاسی نمائندگی، احساس کمتری کا خاتمہ اور برادرانِ وطن کی غلط فہمیوں کا ازالہ جیسے عناوین کے تحت سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور لائحہ عمل پیش کیا گیا ہے۔

چوتھی فصل ”سیاسی میدان میں باہمی تعاون“ کے عنوان سے ہے۔ سیاست میں مسلمانوں کی مضبوط نمائندگی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے لیے اپنے حقوق کی بازیابی، جمہوری اقدار و روایات مخالف پالیسی کی روک تھام، برادران وطن کے سامنے اسلامی تعلیمات کی پیش کش اور مبنی بر اخلاق و اقدار سیاست کا قیام دشوار ہو گیا ہے۔ اس دوری کا ظاہری سبب صاحب کتاب نے مسلمانوں کی زندگی میں دین و سیاست کی تفریق قرار دیا ہے۔

اس سلسلے میں مختلف قرآنی نصوص سے متعدد قابل قدر نتائج اخذ کیے ہیں اور غیر اسلامی نظام حکومت میں شرکت کے جواز کے کئی دلائل پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر علی صلابی کے حوالے سے امام قرطبیؒ، امام الوسیؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام شوکانیؒ اور سید قطبؒ کے نام مجوزین کی فہرست میں پیش کیے ہیں۔ نیز اس رائے کے پس پشت کار فرما اصولوں کو درج ذیل عناوین کے تحت تفصیل سے بیان کیا ہے:

☆ بقدر استطاعت ظلم و شر کو ختم کرنا مطلوب ہے۔
☆ زیادہ نقصان کے مقابلے میں کم نقصان برداشت کیا جائے گا۔
☆ واقعیت کی طرف لوٹنا۔
☆ تدریج کی سنت۔

اس فصل کے اخیر میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ سیاسی قوت سے مراد کیا ہے؟ ہندوستانی مسلمان سیاسی قوت کیسے حاصل کریں؟ سیاسی نظریات میں مقبول ترین اصلاح سافٹ پاور (Soft Power) کو حل کے طور پر پیش کیا ہے۔

تیسرا باب ”باہمی تعاون کی راہ میں درپیش رکاوٹیں“ ہے۔ اس میں باہمی تعاون سے متعلق چار اہم رکاوٹوں؛

۱۔ تعلیم و شعور کی کمی، ۲۔ اعتماد کا فقدان، ۳۔ مفاد کا ٹکراؤ، ۴۔ ’سماجی درجہ بندی اور برادری واد‘ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

چوتھا اور آخری باب ”مسلمانوں کے مستقبل پر باہمی تعاون کے اثرات“ ہے۔ اس میں اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ امت مسلمہ ہند کا تعاون باہمی کے پیرائے میں آنے سے مسلمانوں کے مستقبل پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ لہٰذا اس باب میں خصوصی اثرات، عمومی اثرات، روابط کی مضبوطی، وحدت کا ملی اظہار اور مثالی معاشرے کی تشکیل کے عنوان کے تحت گفتگو کی ہے۔

کتاب کی چند نمایاں خصوصیات:

☆ اس کتاب میں مصنف نے بڑی عرق ریزی سے عنوان سے متعلق بھرپور مواد کو فراہم کیا ہے۔
☆ جا بجا قرآنی آیات اور احادیث سے استدلال کیا ہے۔
☆ آیات کی تشریح و توضیح کے لیے مفسرین کی آراء اور ان کے اقوال کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔
☆ حسبِ ضرورت آیات کی تشریح و توضیح کے بعد عصر حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ان سے اہم نتائج اخذ کیے ہیں۔
اپنی بات کی تائید میں اسلامی مفکرین کی آراء اور ان کے صرف ضروری اقتباسات ہی نقل کیے ہیں۔
☆ قدیم و جدید کتب سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔
حقیقی صورتحال کو بیان کرنے کے لیے تخمین کے بجائے سروے، رپورٹوں اور ریسرچز کے اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔
☆ بات کو عام فہم اسلوب میں چھوٹے چھوٹے جملوں میں پیش کیا ہے۔

اس اہم کتاب کی تصنیف پر مصنف مولانا محمد صادر ندوی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اسلامی اخلاقیات کے اہم عنصر باہمی تعاون کو موضوع بحث بنایا اور قدیم و جدید لٹریچر کی روشنی میں اس کے تمام ابعاد و جہات پر جامع گفتگو کی ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو اس علمی کاوش پر اجر عظیم عطا فرمائے اور کتاب کو امت مسلمہ کے لیے نفع بخش بنائے، آمین!

تصانیف مولانا سید جلال الدین عمری رحمۃ اللہ علیہ

تجلیات قرآن	550.00	عصر حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے	52.00
خطبات پاکستان	100.00	انسان اور اس کے مسائل	40.00
غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	345.00	اسلام اور مشکلات حیات	45.00
اسلام ۔ انسانی حقوق کا پاسبان	90.00	خدا کی غلامی ۔ انسان کی معراج	30.00
غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	40.00	اسلام اور وحدت بنی آدم	16.00
صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	250.00	اسلام میں خدمت خلق کا تصور	150.00 (HB)
خدا اور رسول کا تصور ۔ اسلامی تعلیمات میں	140.00	انسانوں کی خدمت ۔ اسلام کی نظر میں	16.00
معروف و منکر	240.00	جماعت اسلامی ہند ۔ پس منظر، خدمات اور طریقہ کار	70.00
اسلام کی دعوت	280.00	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	30.00
ہندوستان میں اسلام کی دعوت اہمیت اور تقاضے	5.00	ملک و ملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	32.00
عورت ۔ اسلامی معاشرہ میں	400.00	یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟	35.00
مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	130.00	وقت حساب	26.00
عورت اور اسلام	150.00	فقہی اختلافات کی حقیقت	25.00
مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	40.00	سوئے حرم چلا	32.00
اسلام کا عائلی نظام	140.00	اسلام اور انسانی حقوق	18.00
بچے اور اسلام	20.00	قرآن مجید کا تصور تزکیہ	40.00
دولت میں خدا اور بندوں کا حق	30.00	اللہ کی کتاب ہم سے کیا چاہتی ہے؟	20.00
انفاق فی سبیل اللہ	60.00	اسلام کا شورائی نظام	100.00
رحمۃ للعالمین سیرت اور تعلیمات	22.00	کمزور اور مظلوم اسلام کے سائے میں	110.00
نفقہ مطلقہ ایک علمی جائزہ	16.00	دور جدید کے چند فقہی مباحث	100.00
قرآن کا نظام خاندان	30.00	دینی علوم کی تدریس	14.00
حضرت محمدؐ آخری رسول آخری رہنما	30.00	کیا اسلام سے بہتر کوئی دعوت ہو سکتی ہے؟	15.00
انصاف کے گواہ بنو	8.00	موجودہ حالات میں جماعت اسلامی ہند کا لائحہ عمل	12.00
بعض اہم اسلامی اصطلاحات اور ان کی تشریح	18.00		

MMI PUBLISHERS مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز
D-307, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025
mmipublishers@gmail.com www.mmipublishers.net 7290092403
Sub Depot: Hyderabad : 9491874087 | Mumbai : 9699167700 | Goa : 9987196549 | Bangalore : 9036996740

दावत ہفت روزہ دعوت نئی دہلی
DAWAT, NEW DELHI
www.dawatnews.net

05/جولائی
تا 11/جولائی
2026

بھاشا کی شدھی کا پرشن

آریہ اقوام کی برصغیر میں آمد اور اس کے لسانی اثرات کا جائزہ

صلاح احمد صابری، دربھنگہ

پچھلی قسط میں ہم نے قبل از آریہ ادوار کے لسانی منظرنامے کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ مختلف لسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والی اقوام کے باہمی میل جول اور اثرات سے قدیم ہندوستان کی لسانی تصویر کس طرح تشکیل پائی۔ بعض زبانیں غالب ہو گئیں، بعض معدوم ہو گئیں اور بعض الگ تھلگ رہ گئیں، جبکہ بہت سی زبانیں وقت کے ساتھ اپنی صورت بدلتی رہیں۔

اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے آئندہ چند اقساط میں ہم آریہ اقوام کی برصغیر آمد اور اس کے لسانی اثرات کا جائزہ لیں گے۔ اس سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ آخر آریہ کون تھے اور کہاں سے آئے؟ کیا وہ برصغیر کے مقامی باشندے تھے اور یہاں سے دنیا کے دوسرے علاقوں میں پھیلے؟ یہ سوال صرف لسانی اور تاریخی اعتبار سے ہی اہم نہیں بلکہ اس پر طویل عرصے تک علمی اور سیاسی بحثیں ہوتی رہی ہیں اور مختلف مذہبی، سیاسی اور ثقافتی حلقوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اس مسئلے کو سمجھنے اور اس کی توضیح کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہم یہاں اس موضوع کا جائزہ غیر جانب دار اور علمی انداز میں لیں گے۔ جہاں اہلِ علم کے درمیان اتفاقِ رائے موجود ہے وہاں اس کی نشاندہی کریں گے اور جن مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے وہاں مختلف آراء کا ذکر بھی کریں گے۔ چونکہ یہ بنیادی طور پر ایک تاریخی مسئلہ ہے، اس لیے مورخین اور متعلقہ شعبوں کے ماہرین، مثلاً ماہرینِ آثارِ قدیمہ (Archaeologists) ماہرینِ لسانیات (Linguists) اور ماہرینِ جینیات (Geneticists) کی آراء کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگی۔ مذہبی رہنماؤں، سیاسی قائدین، سماجی کارکنوں، فلم و ٹیلی ویژن کی شخصیات یا سوشل میڈیا انفلوئنسرز کی آراء سماجی اثر ضرور رکھتی ہیں، لیکن علمی حیثیت متعلقہ ماہرین کو حاصل ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل میں ہم آریاؤں کی آمد سے متعلق دلائل کا زمانی ترتیب سے جائزہ لیں گے اور ان کے اثرات پر بھی مختصراً گفتگو کریں گے۔ اس مسئلے پر بحث عموماً چار اہم ماخذ کی بنیاد پر کی جاتی ہے: تحریری روایات، لسانیات، آثارِ قدیمہ اور جینیات۔

1- تحریری روایات (Literary Sources): تاریخ کے کسی معروف قدیم ماخذ میں آریاؤں کے آبائی وطن، ترک وطن یا برصغیر آمد کا واضح ذکر نہیں ملتا۔ آریاؤں کی آمد کا زمانہ عموماً ۱۵۰۰ قبل مسیح کے آس پاس بتایا جاتا ہے، لیکن اس تصور کا صریح بیان ہمیں ۳۵۰۰ سالوں بعد یورپی

آریائی مسئلہ جلد ہی محض لسانی بحث نہ رہا بلکہ مذہبی، سیاسی اور ثقافتی حلقوں میں بھی زیرِ بحث آ گیا۔ آریہ کی ہندوستان آمد کے دلائل اتنے وزنی تھے کہ تاریخ کے علاوہ بھی مختلف علوم کے ہندوستانی علماء اس کو نظر انداز نہیں کر سکے۔ تلک نے آریاؤں کے آرکٹک وطن کا نظریہ پیش کیا، سوامی دیانند نے تبت سے آمد کے حق میں رائے دی۔ سوامی وویک آنند کے میکس مولر سے اچھے تعلقات تھے اور ان کی تعریف کی۔ جبکہ بعض اہلِ علم نے ہندوستان ہی کو آریاؤں کا اصل وطن قرار دیا۔ مسلمان اہلِ علم بھی اس بحث سے لاتعلق نہیں رہے۔ مولانا مودودی نے الجہاد فی الاسلام میں تقابل ادیان کے باب میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔

مصنفین کی تحریروں میں ملتا ہے۔ ہندوستانی قدیم گرنتھوں میں بھی اس بارے میں کوئی قطعی روایت موجود نہیں۔ تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آریاؤں کی آمد کا تصور محض ایک جدید مفروضہ، جھوٹ اور مغربی مصنفین کا پروپیگنڈہ ہیں؟ اگر ایسا واقعہ واقعی پیش آیا تھا تو آخر ہزاروں سال تک اس کا واضح ذکر کسی تحریری ماخذ میں کیوں نہیں ملتا؟

بظاہر یہ اعتراض وزن رکھتا ہے، لیکن اگر صرف اسی بنیاد کو معیار مان لیا جائے تو انسانی تاریخ کا بڑا حصہ مشکوک ہو جائے گا۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی تہذیب کا ذکر بھی کسی قدیم تاریخی کتاب میں نہیں ملتا۔ اسی طرح مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی تاریخ کا بڑا حصہ براہِ راست تحریری روایات سے محروم ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرقِ وسطیٰ اور کسی حد تک چین کے سوا دنیا کی بیشتر قدیم تاریخ کو بھی رد کرنا پڑے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم ادوار میں تحریری ریکارڈ کا نہ ہونا کسی واقعے کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اسی لیے مورخین تاریخ کی تشکیل میں تحریری روایات کے ساتھ آثارِ قدیمہ، لسانیات اور جینیات جیسے دوسرے ماخذ سے بھی مدد لیتے ہیں۔

2- لسانیات (Linguistics): آریائی مسئلے کی بحث میں لسانیات بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یورپی اہلِ علم ابتدا میں ہندوستانی علوم سے فارسی تراجم کے ذریعے واقف ہوئے۔ مغلیہ دور میں اپنشد اور دیگر مذہبی متون کے جو فارسی تراجم ہوئے تھے، انہی کے ذریعے یورپ میں ہندوستانی فکر و ادب کا تعارف پہنچا۔ بعد میں جب ان کی کالونیاں ہندوستان میں قائم ہوئیں تو مقامی زبانوں اور اہلِ علم سے براہِ راست رابطہ قائم ہوا۔ اس دور میں بھی بیشتر ہندوستانی پنڈت انگریزی سے واقف نہیں تھے، اس لیے سنسکرت متون کے فارسی تراجم عموماً ان کے ذریعے تیار کیے جاتے تھے جنہیں بعد میں یورپی اہلِ علم اپنی زبانوں میں منتقل کرتے تھے۔ بعد ازاں انگریزوں نے انتظامی ضرورتوں اور علمی دلچسپی کے تحت خود ہندوستانی زبانیں اور سنسکرت سیکھنا شروع کیں، جس سے انڈولوجی (Indology) کے شعبے کو خاص فروغ ملا۔

اس سلسلے میں سر ولیم جونز کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ متعدد قدیم و جدید زبانوں کے ماہر تھے، کلکتہ میں جج و ایشیاٹک سوسائٹی کے بانی بھی تھے۔ انہوں نے سنسکرت، فارسی، یونانی اور لاطینی جیسی زبانوں کے درمیان نمایاں مماثلتوں کی نشاندہی کی۔ اگرچہ اس بات کا ذکر ان سے پہلے بھی بعض یورپی اہلِ علم کر چکے تھے، لیکن انہوں نے اس مشاہدے کو منظم علمی انداز میں پیش کیا۔ لسانی یکسانیت کے مشاہدے کا لازمی نتیجہ تھا کہ یہ زبانیں ایک ہی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور کسی زمانے میں ان کی ایک مشترک جدامجد زبان موجود تھی

اس مفروضہ زبان کو پروٹو ہند یورپی (Proto-Indo-European) اور اس کے خاندان کو ہند یورپی لسانی خاندان (Indo-European Language Family) کا نام دیا گیا۔ ماہرین کے مطابق وقت کے ساتھ مختلف انسانی گروہ الگ الگ علاقوں میں پھیل گئے، ان کی زبانوں میں تبدیلیاں آتی گئیں اور بالآخر سنسکرت، فارسی، یونانی، لاطینی اور دیگر زبانیں وجود میں آئیں۔ اس خاندان کی زبانیں مشرق میں ہندوستان سے لے کر مغرب میں یورپ تک وسیع خطے میں تسلسل کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ آگے چل کر پروٹو ہند یورپی زبانوں کا علاقہ درمیانی یوریشیائی چراگاہ کو مانا گیا۔

اسی پس منظر میں انیسویں صدی میں ویدوں، اوستا اور یونانی ادب، خصوصاً الیڈ اور اوڈیسی کا گہرا مطالعہ کیا گیا۔ اس دور میں میکس مولر (Max Muller) کا نام بھی نمایاں ہے۔ وہ جرمن نژاد سنسکرت داں اور انڈولوجسٹ تھے۔ دلچسپی کی بات ہے کہ انہوں نے ہندوستان کا کبھی دورہ نہیں کیا اور زندگی بھر انگلینڈ میں ہی مقیم رہے۔ انہوں نے آریہ حملہ کی تھیوری کو علمی جواز فراہم کرنے اور اسکی ترویج میں اہم کردار ادا کیا اور ویدوں کی تشریحات کے ذریعے ان کے حق میں دلائل پیش کیے۔

آریائی مسئلہ جلد ہی محض لسانی بحث نہ رہا بلکہ مذہبی، سیاسی اور ثقافتی حلقوں میں بھی زیرِ بحث آ گیا۔ آریہ کی ہندوستان آمد کے دلائل اتنے وزنی تھے کہ تاریخ کے علاوہ بھی مختلف علوم کے ہندوستانی علماء اسکو نظر انداز نہیں کر سکے۔ تلک نے آریاؤں کے آرکٹک وطن کا نظریہ پیش کیا، سوامی دیانند نے تبت سے آمد کے حق میں رائے دی۔ سوامی وویکانند کے میکس مولر سے اچھے تعلقات تھے اور ان کی تعریف کی۔ جبکہ بعض اہلِ علم نے ہندوستان ہی کو آریاؤں کا اصل وطن قرار دیا۔ مسلمان اہلِ علم بھی اس بحث سے لاتعلق نہیں رہے۔ مولانا مودودی نے الجہاد فی الاسلام میں تقابل ادیان کے باب میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ سید سلیمان ندوی و دیگر علماء بھی اپنی کتب، خطبات اور خطوط میں اسکا تذکرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایسی بحث تھی جس سے کوئی بھی متعلقہ حلقہ اچھوتا نہیں رہا اور آج بھی اس پر گفتگو جاری ہے۔

مجموعی طور پر جدید تاریخ، لسانیات اور متعلقہ علوم کے بیشتر ماہرین آریائی لسانی گروہوں کی برصغیر آمد کے تصور کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن عوام کے بیچ ماہرین سے زیادہ مذہبی رہنما، سیاسی لیڈر، سماجی کارکنان، فلم، ٹیلیویژن، سوشل میڈیا انفلوئنسرز وغیرہ کی رسائی ہے۔ اس وجہ سے تاریخ کی مستند کتب میں کچھ بھی لکھا ہو عوام کے بیچ باتیں ایسے آتی ہیں کہ لوگوں کو محسوس ہو کہ آریہ آمد غلط نہ صحیح، اہل علم کے درمیان یہ مسئلہ اختلافی ضرور ہے۔

بحرِ حال، یہ تو اس بحث کی تاریخ ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ آریائی آمد کے حق میں لسانی دلائل کیا ہیں؟ اگر ہم صرف مختلف آراء اور شخصیات کے ردِ عمل پر اکتفا کریں تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان لسانی دلائل کا مختصراً جائزہ لیا جائے۔ سب سے پہلے ہم قدیم یونانی، لاطینی، سنسکرت اور فارسی کے چند بنیادی الفاظ پر نظر ڈالتے ہیں۔

	الفاظ (اردو)	انگریزی	قدیم/جدید فارسی	سنسکرت	قدیم یونانی	قدیم لاطینی
۱	ماں	mother	Mātar/madr	mā́tṛ	mḗtēr	māter
۲	باپ	father	pitar/pesar	pitṛ	patḗr	pater
۳	بھائی	brother	Brātar/bradr	Bhrātār	phrā́tēr	frāter
۴	بیٹی	daughter	dugedar/ Dokhtar	duhitar	thugátēr	futír
۵	دو	two	Dva/do	dvā́	dúō	duo
۶	تین	Threeth	thrayō/sah	tráyas	treîs	trēs
۷	آٹھ	eight	ašta/hasht	ashṭā́	oktṓ	octō
۸	شہد	Mead	Mádu	mádhu	méthu	mēdus
۹	سونا/خواب	sweven	xvafna/ khwab	svápna	húpnos	somnus
۱۰	نام	nāma	stā̆rəm	nā́ma	ónoma	nōmen

مندرجہ بالا الفاظ پر ایک سرسری نظر بھی ان زبانوں کی باہمی قربت کو ظاہر کرتی ہے۔ یہاں صرف چند مثالیں دی گئی ہیں، ورنہ ایسے سیکڑوں الفاظ موجود ہیں جن کی صورت اور معنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ ہزاروں میل کے فاصلے پر بولی جانے والی قدیم زبانوں میں ماں، باپ، بھائی، گنتی اور دیگر بنیادی الفاظ اس قدر مشابہ ہوں؟ اگر نہیں، تو اس سے یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ کسی زمانے میں ان زبانوں کے متکلمین کا باہمی گہرا تعلق رہا ہوگا اور زمانہ قدیم میں انسانوں کی آبادی کی منتقلی ہوئی ہو۔

اس کی مختلف توضیحات ممکن ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ آریائی لسانی گروہ باہر سے برصغیر میں آیا۔ یہ موجودہ علمی حلقوں میں رائج تصور ہے اور اس کو مان لیں تو کوئی بحث ہی نہیں ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ آریائی لسانی گروہ برصغیر سے نکل کر باہر پھیلا۔ تاہم اس مفروضے کے سامنے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

- اگر ایسا ہوا تو آریائی زبانوں کا پھیلاؤ بنیادی طور پر مغرب کی جانب ہی کیوں نظر آتا ہے؟ پورب میں برما، دکھن میں جنوبی ہندوستان اور اتر میں چین ہے جہاں آریائی زبانیں نہیں بولی جاتیں، لیکن دوسری جانب دس ہزار کلومیٹر سے بھی زیادہ دور انگلینڈ تک آریائی زبان پھیل گئیں وہ بھی دور قدیم میں جب آمد و رفت کے زرائع خاص نہیں تھے۔
- اس مفروضے کو ماننے میں دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی انسانی گروہ ہجرت کریگا تو اس کے ساتھ صرف سنسکرت کے الفاظ ہی کیوں جائیں گے؟ دراوڑی یا دیگر لسانی خاندانوں کے بھی الفاظ ساتھ جائیں گے۔ جبکہ مغربی زبانوں کی قربت صرف سنسکرت یا شمالی ہندوستانی زبانوں سے ہی ہے۔ اس مفروضے کو درست ماننے کے لیے یہ فرض کرنا پڑے گا کہ اس وقت سنسکرت دنیا کے بڑے حصے میں پھیل گئی تھی لیکن پڑوس کی دراوڑی زبانوں سے اس کا تعلق پیدا نہیں ہوا تھا یا پھر دراوڑی و دیگر زبانوں کے متکلمین ہندوستان میں بعد میں آئے۔

لسانی تحقیق میں قدیم متون کی اندرونی شہادت بھی اہم سمجھی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بعض جانوروں سے متعلق الفاظ مختلف ہند یورپی زبانوں میں مشترک ملتے ہیں۔ رگ وید میں گھوڑے کا تذکرہ بکثرت آتا ہے، جبکہ گھوڑے کی قدیم افزائش اور پھیلاؤ کا مرکز عموماً یوریشیائی چراگاہوں کو سمجھا جاتا ہے۔ بعد کے تاریخی ادوار میں بھی ہندوستان اچھی نسل کے گھوڑوں کے لیے بیرونی علاقوں پر انحصار کرتا رہا۔ اگر آریائی لسانی گروہ ہندوستان سے باہر گیا ہوتا تو توقع کی جاتی ہے کہ ہندوستانی جانوروں، پودوں اور مقامی ماحول سے متعلق الفاظ کے آثار بھی ان زبانوں میں نمایاں طور پر ملتے۔ اسی بنا پر ماہرین ان جانوروں کو آریائی زبانوں کی ابتدائی تاریخ سمجھنے میں دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر دراوڑی زبانوں، مثلاً تیلگو اور کنڑ یا جنوب مشرقی ایشیا کی بعض زبانوں میں سنسکرت کے بے شمار الفاظ موجود ہیں تو پھر انہیں سنسکرت سے نکلی ہوئی یا اسی لسانی خاندان کی زبانیں کیوں نہ مانا جائے؟

- اس سوال کے جواب کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تمام الفاظ یکساں اہمیت نہیں رکھتے۔ ہر زبان میں کچھ بنیادی الفاظ ہوتے ہیں جو ہزاروں سال سے مستعمل ہیں، مثلاً ماں، باپ، بھائی، بہن، بنیادی اعداد، اور فطرت سے متعلق الفاظ جیسے سورج، چاند، پانی، ہوا اور آگ۔ دوسری طرف ایسے الفاظ بھی ہیں جو تہذیبی ترقی، تجارت یا ثقافتی روابط کے ذریعے زبانوں میں داخل ہوتے ہیں، مثلاً کاغذ، قلم، کپڑا، مشین یا کمپیوٹر۔ اگر کمپیوٹر کا لفظ انگریزی اور تیلگو میں ایک ہو یا قلم کا لفظ عربی اور ہندی میں مشترک ہو تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ دونوں زبانیں ایک ہی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اصل اہمیت ان بنیادی الفاظ کی ہے جو ہزاروں سال تک نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جب ہزاروں میل دور واقع قدیم زبانوں میں ایسے بنیادی الفاظ یکساں ملتے ہیں تو یہ محض الفاظ کا مستعار نہیں ہے۔
- مزید یہ کہ زبانوں کے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے کے لیے صرف چند الفاظ کی مماثلت کافی نہیں ہوتی، بلکہ ان کی ساخت، قواعد وغیرہ میں بھی باقاعدہ مماثلت دیکھی جاتی ہے مثلاً اردو اور پنجابی۔ ان تفصیلات کا تعین ماہرینِ لسانیات تقابلی مطالعے کے ذریعے کرتے ہیں۔ غور کریں تو دراوڑی یا جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی زبانوں کے ملتے جلتے الفاظ، کیا وہ بھی انسانی آبادی کے تبادلے کے بغیر ممکن ہوئے ہیں؟ کیا شمالی و جنوبی ہندوستان میں آبادیوں کا آنا جانا ہزاروں سالوں سے نہیں ہو رہا ہے؟ یا ہندوستان سے پورب کے ممالک میں روابط قائم نہیں رہے ہیں؟
- آج ذرائع ابلاغ، نقل و حمل اور مواصلات نے زبانوں کے درمیان الفاظ کے تبادلے کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے ایک لفظ مختصر عرصے میں دنیا بھر میں پھیل سکتا ہے۔ لیکن قدیم زمانے میں صورت حال مختلف تھی۔ اس وجہ سے دو مختلف علاقوں میں زبانوں کے بنیادی الفاظ کے یکساں پائے جانے کے لیے بڑی تعداد میں آبادی کی منتقلی اور مستقل قیام ضروری تھا۔ ورنہ اتنا بڑا لسانی اثر ممکن نہیں ہے۔
- اسی تناظر میں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ آج ہندوستانی گھروں میں ممی، ڈیڈی، پاپا، انکل اور آنٹی جیسے الفاظ عام ہیں۔ کیا اس سے تمام ہندوستانی زبانیں انگریزی کی خواہر زبان بن جاتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دورِ جدید کا عمل ہے، اور اس میں بھی انسانی آبادیوں کی نقل و حرکت اور جدید ذرائع ابلاغ کا کردار رہا ہے۔ قدیم زمانے میں ایسی سہولت موجود نہیں تھی۔ اس لیے دورِ جدید کے حالات کو بعینہٖ قدیم زمانے پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔
- بالفرض اگر ہندوستان کے کسی علاقے کے لوگ بتدریج اپنی مقامی زبان چھوڑ کر کوئی بیرونی زبان، مثلاً انگریزی، اختیار کر لیں اور اس کے قواعد بھی اپنا لیں، جبکہ پرانی زبان کے چند الفاظ بگڑی ہوئی صورت میں باقی رہ جائیں تو نئی زبان انگریزی ہی کی ایک دختر یا خواہر زبان شمار ہوگی۔ قدیم زبان معدوم ہو جائے گی اور اس کے بچے ہوئے عناصر کو لسانیات میں substrate language کہا جاتا ہے۔ اس موضوع پر آگے مزید گفتگو ہوگی۔

3- ثقافت و مذہب (Culture and Religion): لسانیات کے بعد ایک اور پہلو ثقافت اور مذہب کا ہے جسے مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ یہ شواہد اپنے طور پر فیصلہ کن نہیں، لیکن دیگر دلائل کی تائید میں معاون ضرور ہیں۔ ان میں ایک اہم عنصر آگ کی غیر معمولی اہمیت

بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر-04

جنگ بندی کے بعد نئی کشمکش

یادداشتِ اسلام آباد، سوئٹزرلینڈ مذاکرات اور اب خلیج میں نئی کشیدگی

مسعود ابدالی

سوئٹزرلینڈ میں ایران اور امریکہ کے درمیان ہونے والے مذاکرات کے پہلے دور کو دونوں فریقوں نے حوصلہ افزا قرار دیا۔ امریکی نائب صدر جے ڈی وانس نے کہا کہ تنازع کے پرامن اور باوقار حل کی بنیاد رکھ دی گئی ہے، جبکہ ایرانی وزیر خارجہ سید عباس عراقچی کے مطابق مذاکرات خوشگوار ماحول میں ہوئے اور اب تکنیکی ٹیمیں مجوزہ معاہدے پر عمل درآمد کی تفصیلات طے کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر ضرورت پیش آئی تو ایران، امریکی وفد سے مزید ملاقاتوں کے لیے بھی تیار ہے۔

مذاکرات کے بعد ابتدائی طور پر حالات میں بہتری کے آثار دکھائی دیے۔ امریکہ نے ایران کے خلاف بعض پابندیوں اور بحری ناکہ بندی میں نرمی کے اقدامات کیے، جبکہ بعض غیر مصدقہ اطلاعات میں ایران کے منجمد اثاثوں کے جزوی اجرا کا بھی دعویٰ کیا گیا۔ دوسری طرف ایران نے آبنائے ہرمز میں تجارتی جہازوں کی آمد و رفت بحال کر دی ہے جس کا عالمی سطح پر خیر مقدم ہوا اور تیل کی قیمتوں میں کمی سے درآمد کنندہ ممالک نے بھی اطمینان کا سانس لیا ہے۔

جنگ بندی پر پہلا دھچکا

یہ خوش آئند فضا زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ ایرانی حکام کے مطابق 25 جون کو چار تجارتی ٹینکر آبنائے ہرمز میں مقررہ بحری راستوں سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے۔ پاسدارانِ انقلاب نے انہیں روکنے کے لیے تنبیہی فائرنگ کی، جس کے نتیجے میں سنگاپور کے پرچم بردار ایک جہاز کو نقصان پہنچا۔ ایرانی فوج کا موقف تھا کہ تمام جہاز راں اداروں کو تحریری طور پر آگاہ کیا جا چکا تھا کہ آبنائے ہرمز سے گزرنے والے تمام جہاز نہادِ مدیریت آبراہِ خلیج فارس (PGSA) کی جانب سے مقرر کردہ بحری راستوں کی پابندی کریں۔ لیکن متعلقہ جہازوں نے ان ہدایات کو نظر انداز کیا جس کے بعد انہیں واپس مڑنے پر مجبور کیا گیا۔ ساتھ ہی تہران نے یہ بھی اعلان کیا کہ جو جہاز PGSA کی ہدایات پر عمل کریں گے، انہیں یادداشتِ اسلام آباد کی شق 5 کے مطابق مکمل تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

واشنگٹن نے ایرانی وضاحت مسترد کرتے ہوئے محدود فضائی کارروائیاں کیں، جس کے جواب میں پاسدارانِ انقلاب نے بحرین میں امریکی پانچویں بحری بیڑے کے صدر مقام سمیت خطے میں متعدد امریکی تنصیبات کو نشانہ بنایا۔ امریکی نائب صدر جے ڈی وانس نے دھمکی میں گندھی مفاہمت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تشدد کا جواب تشدد سے ملے گا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ MOU کی تشریح میں کسی ابہام پر لبلبی دبانے کے بجائے فون کر لیا جائے۔ صدر ٹرمپ نے بھی جہازوں پر ایرانی فائرنگ کو جنگ بندی کی "احمقانہ خلاف ورزی" قرار دیا، لیکن ان کے ابتدائی بیانات سے یہ تاثر نہیں ملا کہ امریکہ کسی وسیع عسکری کارروائی کی تیاری کر رہا ہے۔

کشیدگی کا دوسرا مرحلہ -- صدر ٹرمپ کی آتش فشانی

دوسرے دن کشیدگی اس وقت شدت اختیار کر گئی جب امریکی طیاروں نے ایران کے ساحلی علاقوں، سیریک، بندر لنگہ اور جزیرہ قشم میں اہداف کو نشانہ بنایا۔ اس کے جواب میں ایران نے بحرین میں امریکی بحری اڈے، کویت کے علی السالم فضائی اڈے اور خطے میں دیگر امریکی تنصیبات پر میزائل حملے کیے۔ صدر ٹرمپ نے دھمکی آمیز ٹویٹ میں کہا کہ اگر خلاف ورزیاں جاری رہیں تو امریکہ اپنے فروری میں شروع کیے گئے مشن کو "منطقی انجام" تک پہنچائے گا، اور اگر ایسا ہوا تو "اسلامی جمہوریہ کا نام و نشان مٹ جائے گا"۔ پاکستان اور قطر نے کشیدگی کم کرنے کے لیے سفارتی کوششیں شروع کر دیں اور اطلاعات کے مطابق فیلڈ مارشل عاصم منیر نے امریکی نائب صدر اور ایرانی اسپیکر محمد باقر قالیباف سے رابطہ کیا۔ ایران نے امریکہ سے امن معاہدے کے لیے ٹیکینکل کمیٹی کی گفتگو یہ کہہ کر معطل کر دی کہ حملے اور دھمکیوں سے امریکہ کی بدنیتی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر گفتگو جاری رکھنی ہے تو واشنگٹن کو بات چیت اور بارود میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ تادم تحریر دونوں جانب سے کسی نئے حملے کی اطلاع نہیں آئی جس سے لگتا ہے کہ ہے 'سولجر ڈپلومیٹ' کی سفارت کاری ایک بار پھر کامیاب رہی۔

کیا یہ اسرائیل کی جنگ ہے؟ امریکہ میں ایک نئی بحث کا آغاز

امریکہ میں صدر ٹرمپ کے مخالفین مسلسل الزام لگا رہے ہیں کہ ایران کے خلاف جنگ میں اسرائیل نے امریکہ کو گھسیٹا ہے۔ جبکہ صدر ٹرمپ کا اصرار ہے کہ امریکی کارروائیاں مکمل طور پر امریکی قومی مفادات اور عسکری منصوبہ بندی کے تحت کی گئی ہیں۔

اس بحث کو اس وقت نئی تقویت ملی جب گزشتہ ہفتے وزیر اعظم نیتن یاہو نے تل ابیب میں بلدیاتی نمائش MUNIExpo کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ 13 جون 2025 کو ایران کے خلاف عسکری کارروائی کا فیصلہ اسرائیل نے خود کیا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس کارروائی کے لیے صدر ٹرمپ سے اجازت نہیں لی گئی بس انہیں پیشگی اطلاع دے دی گئی تھی اور خوشی کی بات یہ ہے کہ چند دن بعد امریکہ بھی اس مہم میں ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ نیتن یاہو نے اپنے دفاع میں یہودی فقہ اور مذہبی تشریحات کے بنیادی ماخذ، تلمود کا حوالہ پیش کیا جس کے مطابق اگر کوئی تمہیں قتل کرنے کے لیے آرہا ہو تو بہتر ہے کہ آگے بڑھ کر تم خود اسے قتل کر دو۔ اس بیان نے واشنگٹن میں جاری بحث کو نئی جہت دے دی ہے کہ آیا امریکہ نے اپنے تزویراتی مفادات کے تحت جنگ میں شمولیت اختیار کی یا وہ اپنے قریبی اتحادی کی ابتدائی کارروائی کے نتیجے میں اس تنازعے کا حصہ بن گیا؟

عمان کے شمالی علاقے مسندم جزیرہ نما کے قریب آبنائے ہرمز میں لنگر انداز کشتیوں کا فضائی منظر۔

بڑے بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

وال اسٹریٹ جرنل کے مطابق ایرانی میزائل حملوں سے پہنچنے والے نقصانات کے بعد امریکی وزارت جنگ، خلیج میں قائم اپنے بعض فوجی اڈوں کو مزید مغرب کی جانب منتقل کرنے کے مختلف امکانات پر غور کر رہی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ایرانی حملوں میں امریکی عسکری تنصیبات کو خاصا نقصان پہنچا، 13 کے قریب فوجی بھی جان سے گئے اور زخمیوں کی تعداد سینکڑوں میں بتائی جا رہی ہے۔ رپورٹ کے مطابق، بحرین میں واقع امریکی بحری اڈے NSA Bahrain کو پہنچنے والے نقصانات کا ابتدائی تخمینہ تقریباً 40 کروڑ ڈالر لگایا گیا ہے۔ یہی اڈہ امریکی پانچویں بحری بیڑے (Fifth Fleet) کا صدر مقام ہے اور ایران سے اس کا فاصلہ تقریباً 240 کلومیٹر ہے، جس کے باعث یہ تزویراتی اعتبار سے ہمیشہ حساس مقام رہا ہے۔ اگر بحرینی اڈے کی منتقلی کا فیصلہ ہوا تو یہ طوفانِ بلا کہاں جائے گا؟ جغرافیائی اعتبار سے اسرائیل کی بندرگاہ ایلات ایک ممکنہ انتخاب سمجھی جا سکتی ہے، جہاں سے خلیجِ عقبہ، بحیرہ احمر، نہرِ سوئز اور بحیرہ روم تک نسبتاً آسان رسائی حاصل ہے۔ اسی طرح حیفہ بھی امریکی بحری موجودگی کے لیے ایک متبادل مقام بن سکتا ہے۔ تاہم اس حوالے سے ابھی کوئی باضابطہ فیصلہ سامنے نہیں آیا۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کویت اور سعودی عرب میں موجود بعض امریکی تنصیبات کے حجم میں کمی (downsizing) اور کچھ عسکری اثاثوں کی منتقلی پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ اطلاعات درست ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ حالیہ جنگ نے صرف عسکری نقصان ہی نہیں پہنچایا بلکہ امریکہ کو خلیج میں اپنی دفاعی حکمتِ عملی پر بھی نظرِ ثانی پر مجبور کر دیا ہے۔ کسی فوجی اڈے کی منتقلی محض مقام کی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ اربوں ڈالر کے اخراجات، حمل و نقل کا نیا نظام، دفاعی ڈھانچے اور سب سے بڑھ کر علاقائی سیاسی و عسکری توازن پر نظرِ ثانی کرنی پڑتی ہے۔ اسی تناظر میں وزیرِ جنگ پیٹ ہیگستھ کی کانگریس سے ایرانی جنگ کے اخراجات کی مد میں 80 ارب ڈالر طلب کیے جانے کی اطلاعات بھی قابلِ فہم محسوس ہوتی ہیں، اگرچہ اس رقم کی حتمی منظوری اور تفصیلات ابھی سامنے آنا باقی ہیں۔

ایران کا نیا علاقائی تصور۔ نیا نیو ورلڈ آرڈر؟

دوسری جانب ایران اس بحران کو اپنے علاقائی کردار کے نئے تصور کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آذربائیجان کے دارالحکومت باکو میں اسلامی ممالک کی پارلیمانی یونین (PUIC) کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ایرانی پارلیمنٹ کے اسپیکر محمد باقر قالیباف نے کہا کہ خطے کی بدقسمتیوں کی جڑ صہیونی حکومت ہے اور اب جبکہ امریکی طاقت کا بھرم ٹوٹ چکا ہے، مسلم ممالک کو اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کرتے ہوئے ایک "مسلم علاقائی نظام" تشکیل دینا چاہیے۔ انہوں نے ترک اور آذربائیجانی اسپیکرز سے ملاقات میں بھی مسلم اتحاد پر زور دیا۔ اگرچہ کہ ایسے علاقائی نظام کی تشکیل آسان نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایران اب اپنے سفارتی بیانیے میں "علاقائی خود انحصاری" کو پہلے سے کہیں زیادہ نمایاں انداز میں پیش کر رہا ہے یا یوں کہیے کہ باقر قالیباف علامہ اقبال کی اس نصیحت پر عمل پیرا دکھائی دیتے ہیں کہ تہران کو عالمِ مشرق کا "جنیوا" بننا چاہیے۔

(مسعود ابدالی سینئر کالم نگار ہیں۔ عالم اسلام اور بالخصوص مشرق وسطیٰ کی صورت حال کا تجزیہ آپ کا خصوصی میدان ہے)

masood_abdali@hotmail.com

بچوں کو بنگلور میں پڑھانے کا خواب پورا کریں۔
SHAHEEN JAME-UL-ULOOM BANGALORE
(Residential School & College)

Courses offered:
- Grade I to Grade XII
- BCA (Boys & Girls
- B.Com
- Hifz + Course

Join Now
A non-profit community organisation:
Jame-ul-Uloom, Jamia Masjid & Muslim Charitable Fund Trust Bangalore

We support committed students like you. We help you improve your academic performance and prepare for NEET & JEE with the right guidance and strategy.

Don't Lose Hope
Your Future is Still Bright!

CALL US:
+91-9141378643 | 8880001441
7411277844

OFFICE:
Gate No 2, Near Wonderla,
Bannikuppe, Hejjala Post, Bidadi
Hobli, Bangalore South-562109

ISLAMIC WELFARE SOCIETY
(Registered Under Karnataka Societies Registration Act 17 of 1960) Reg. No.: SOCTY/RGN-UK/290/82-83
حصول رزق حلال عین عبادت ہے
Estd.: 1982
سودی شائبہ سے بالکل پاک
غیر سودی قرضہ دے کر بلا تفریق مذہب و ملت
ہزاروں لوگوں کو سود کی لعنت سے بچاتا ہے
☆ زکوٰۃ کی تقسیم کا منظّم انتظام ☆ ضرورت مندوں کے علاج و معالجہ کا نظم
اسلامک ویلفیر سوسائٹی (رجسٹرڈ) بھٹکل
P. O. Box: 19, Sultan Street, Near Old Bus Stand, BHATKAL - 581 320 (Karnataka)
Tel: 08385-226601, Email: iwsocietybkl@gmail.com,

لبنان کا نازک امن، غزہ کا انسانی المیہ اور غربِ اردن کی علمی مزاحمت

ابو فاطمہ

ایران کی جانب سے شدید دباو کے باجود امریکہ لبنان میں امن کے لیے سرائیل کو معقولیت کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوتا نظر نہیں آرہا ہے۔ واشنگٹن میں ہونے والے اسرائیل لبنان اصولی معاہدے(Framework Agreement)کی تعبیر و تشریح ہی مبہم ہے۔ امریکی وزارتِ خارجہ نے معاہدے کے فوراً بعد دعویٰ کیا کہ اسرائیلی فوج کی جنوبی لبنان سے واپسی شروع ہو چکی ہے لیکن اسرائیلی فوج نے فوری طور پر اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ انہیں حکومت کی جانب سے کسی قسم کی واپسی کا حکم موصول نہیں ہوا ہے۔ لبنانی حکومت نے بھی اسرائیلی انخلا کی خبروں کو غلط قرار دیا ہے۔ اسی دوران اسرائیلی وزیرِ دفاع اسرائیل کاٹز نے دوٹوک انداز میں اعلان کیا کہ اسرائیلی فوج غزہ، شام اور لبنان میں غیر معینہ مدت تک موجود رہے گی اور اسرائیل کے دفاع پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ دوسری طرف CNN نے اطلاع دی کہ وزیر اعظم نیتن یاہو نے اسرائیلی فوج کو دریائے لیطانی کے اطراف سے مرحلہ وار پیچھے ہٹنے کی ہدایت دی ہے۔ ساتھ ہی اسرائیلی حکام کی یہ وضاحت بھی سامنے آگئی کہ اس کا مطلب جنوبی لبنان سے مکمل انخلا نہیں بلکہ صرف محدود فوجی ردوبدل ہے اور اہم فوجی چوکیاں حزب اللہ کے غیر مسلح ہونے تک برقرار رہیں گی۔ لبنانی صدر جوزف عون نے اس مؤقف کو مسترد کرتے ہوئے واضح کیا کہ لبنان صرف مکمل فوجی انخلا کو ہی معاہدے پر عمل درآمد تصور کرے گا۔ ادھر حزب اللہ اور دیگر مزاحمتی گروہوں نے بھی اس اصولی معاہدے کو ناقابلِ قبول قرار دیتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ اسرائیلی فوج کے مکمل انخلا تک مزاحمت جاری رہے گی۔

جنگ بندی کے دوران بھی بمباری

امن معاہدے کے باوجود جنوبی لبنان پر اسرائیلی فضائی حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان حملوں کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ نبطیہ شہر میں مرکزی امام بارگاہ کے قریب بم گرائے گئے جس کا مقصد عاشور کی مجلس میں آنے والے مزاحمت کار رہنماوں کو نشانہ بنانا تھا۔ جنگ کے دوران بھی مذہبی عقائد و مقامات کا احترام لازمی ہے۔ سوگواری وعزہ داری کی مجلسوں کو جان بوجھ کر نشانہ بنانا کسی بھی اصول و قانون کے تحت مناسب نہیں ہے۔ اس تمام صورتحال کے باوجود لبنان بھر میں محرم روایتی عقیدت، وقار اور نظم وضبط کے ساتھ منایا گیا۔ بڑے جلوس نکلے، عزاداری کی مجالس منعقد ہوئیں اور یوں لبنانی معاشرے نے یہ پیغام دیا کہ مسلسل بمباری بھی اس کی مذہبی اور سماجی زندگی کو مفلوج نہیں کر سکی۔

امریکہ اور ایران: دشمنی سے رابطے تک

سوئٹزرلینڈ میں جاری مذاکرات کے دوران ایک غیر معمولی پیش رفت اس وقت سامنے آئی جب امریکی نائب صدر جے ڈی وانس نے انکشاف کیا کہ لبنان میں جنگ بندی کو مؤثر بنانے کے لیے تصادم سے بچاؤ کے نظام(Deconfliction Mechanism)پر کام جاری ہے۔ ان کے مطابق اس طریقہ کار کے تحت امریکی مرکزی کمان(CENTCOM)اور ایرانی پاسدارانِ انقلاب(IRGC) کے درمیان عملی رابطے اور ہم آہنگی کا ایک محدود نظام وضع کیا جارہا ہے تاکہ لبنان میں کسی غیر ارادی عسکری تصادم سے بچا جا سکے۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ مستقبل میں قطر میں دونوں جانب کے نمائندوں کے درمیان غیر رسمی ملاقاتیں بھی خارج از امکان نہیں ہیں۔

یہ پیش رفت اپنی نوعیت میں غیر معمولی ہے۔ امریکہ آج بھی پاسدارانِ انقلاب کو دہشت گرد تنظیم قرار دیتا ہے۔ صدر ٹرمپ اپنے پہلے دورِ اقتدار میں بغداد میں جنرل قاسم سلیمانی کے خلاف کارروائی کو اپنی بڑی کامیابی قرار دیتے رہے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست میں مستقل دوست اور مستقل دشمن نہیں ہوتے کہ اصل چیز مفادات ہوتے ہیں۔ جب جنگ کے خطرات بڑھ جائیں تو کل کا ناقابلِ قبول فریق بھی آج مذاکرات اور رابطے کے لیے ناگزیر بن جاتا ہے۔

شام کا محتاط مؤقف

لبنان کے معاملے میں شام نے بھی محتاط سفارتی رویہ اختیار کیا ہے۔ شامی صدر احمد الشرع نے واضح کیا ہے کہ شام لبنان کی خود مختاری اور علاقائی سالمیت کا احترام کرتا ہے اور اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔ صدر ٹرمپ چاہتے ہیں کہ اسرائیل کے بجائے شامی افواج لبنانی حزب اللہ کے خلاف کاروائی کریں جسے صدر الشرع نے مسترد کر دیا ہے۔

غزہ: صرف بچے نہیں ’امید‘ بھی دم توڑ رہی ہے

غزہ کی صورتحال ہر روز بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ اس بحران کا سب سے دردناک پہلو بچوں اور ماؤں کی حالت ہے۔ غزہ کے محکمۂ صحت کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر منیر البرش کے مطابق نومبر 2025 سے اپریل 2026 کے درمیان غزہ میں شرحِ پیدائش میں تقریباً 67 فیصد کمی ریکارڈ کی گئی، جبکہ حمل ضائع ہونے کے واقعات اور حاملہ خواتین میں خون کی شدید کمی تشویشناک حد تک بڑھ چکی ہے۔ ان اعداد و شمار کی عمومی تائید متعدد بین الاقوامی اور علاقائی ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ جنگ میں ختم ہونے والوں کی تعداد تو شمار کی جا سکتی ہے، مگر کسی قوم کی آئندہ نسل کے سکڑتے ہوئے وجود کو صرف اعداد و شمار میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب ہسپتال کھنڈر بن جائیں، ادویات ناپید ہوں، غذائی قلت معمول بن جائے اور حاملہ خواتین بنیادی طبی سہولتوں سے محروم رہ جائیں تو یہ صرف صحتِ عامہ کا بحران نہیں رہتا بلکہ پورے معاشرے کے مستقبل پر براہِ راست حملہ بن جاتا ہے۔ ایک ایسی سرزمین جہاں بچوں کی پیدائش تیزی سے کم ہو رہی ہو، وہاں درحقیقت صرف آبادی نہیں بلکہ امید بھی دم توڑنے لگتی ہے۔

عمان کے شمالی علاقے مسندم جزیرہ نما کے قریب آبنائے ہرمز میں لنگر انداز کشتیوں کا فضائی منظر۔

اقوامِ متحدہ کی رپورٹ: بچوں پر دانستہ حملوں کا الزام

اطفالِ غزہ کے بارے میں اقوام متحدہ کی حالیہ رپورٹ بھی انتہائی تشویشناک ہے جس کے مطابق غزہ کی جنگ کے دوران اسرائیلی کارروائیوں میں فلسطینی بچوں کو دانستہ طور پر نشانہ بنایا گیا۔ مقبوضہ فلسطینی علاقوں سے متعلق آزاد بین الاقوامی تحقیقاتی کمیشن Independent International Commission) of Inquiry on the Occupied Palestinian Territory)کی 94 صفحات پر مشتمل اس رپورٹ کے مطابق بچوں کو پہنچنے والا نقصان اتفاقی یا جنگ کا ضمنی نتیجہ نہیں بلکہ اس کا مقصد غزہ میں فلسطینیوں کو ایک نسل کے طور پر کمزور اور تباہ کرنا تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ چونکہ بچے کسی بھی قوم یا گروہ کی حیاتیاتی اور سماجی بقا کے ضامن ہوتے ہیں، اس لیے ان کے خلاف مسلسل اور منظم کارروائیاں مستقبل کی پوری نسل کو متاثر کرتی ہیں۔ کمیشن نے اسی بنیاد پر یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ بچوں کو نشانہ بنانا فلسطینی معاشرے کے مستقبل کو کمزور کرنے کی ایک دانستہ حکمتِ عملی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی رپورٹ میں اسرائیل سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ غزہ میں اپنی فوجی کارروائیاں فوری طور پر بند کرے۔

نسل کشی کی بحث: قانون کیا کہتا ہے؟

بین الاقوامی قانون میں نسل کشی (Genocide) کا تعین صرف ہلاکتوں کی تعداد سے نہیں کیا جاتا۔ نسل کشی یا Genocide Convention مجریہ 1948 کے مطابق اگر کسی قومی، نسلی، مذہبی یا نسلی گروہ کو مکمل یا جزوی طور پر تباہ کرنے کی نیت سے ایسے اقدامات کیے جائیں جو اس گروہ کی جسمانی، حیاتیاتی یا سماجی بقا کو متاثر کریں تو وہ بھی قانونی بحث کا حصہ بنتے ہیں۔ اسی لیے جدید بین الاقوامی قانون میں صرف قتلِ عام ہی نہیں بلکہ کسی گروہ کی تولیدی صلاحیت (Reproductive Capacity) کو متاثر کرنے والے عوامل بھی غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر جنگ کے نتیجے میں بچوں کی پیدائش نمایاں حد تک کم ہو جائے، حمل ضائع ہونے کی شرح کئی گنا بڑھ جائے، حاملہ خواتین علاج سے محروم رہ جائیں اور پہلے سے پیدا ہونے والے بچے بھی مسلسل جان سے جاتے رہیں تو یہ انسانی بحران سے کہیں زیادہ سنگین المیہ ہے۔ اس تناظر میں یہ رپورٹ اسرائیل کے خلاف نسل کشی کا قانونی ثبوت ہے۔

غربِ اردن: بڑھتا ہوا تشدد اور نئی حکمتِ عملی

غرب اردن میں فائرنگ، چھاپوں اور قبضہ گردی کے ساتھ فلسطینیوں کی آنکھوں میں مرچیں جھونکنے کی کاروائیاں عروج پر ہیں، جس کے نتیجے کئی کم عمر بچوں کی بینائی متاثر ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ستم ظریفی کہ ان وارداتوں کو معمولی جھگڑا اور شرارت کہہ کر نظر انداز کیا جارہا ہے۔

دو ریاستی حل نامنظور

وزیر اعظم نیتن یاہو نے آزاد فلسطین یا دو ریاست فارمولے کو سختی سے مسترد کر دیا ہے۔ ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اسرائیل، اسرائیل (حضرت یعقوبؑ) کے وقت سے ایک ہے اور ہمیشہ ایک رہے گا، یہاں دو ریاستوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فلسطینی ریاست کسی بھی صورت نہیں بنے گی۔ اس معاملے پر اسرائیل میں مکمل اتفاق رائے ہے۔ انہوں نے اس بیانیے کو قومی عزم قرار دینے کے لیے وسیع البنیاد قومی حکومت قائم کرنے کی تجویز بھی پیش کی۔

سرنگ کا دعویٰ اور بڑے آپریشن کے خدشات

اسرائیلی فوج نے غربِ اردن سے یروشلم تک ایک سرنگ کا 'انکشاف' کیا ہے۔ سطح زمین سے 25 میٹر نیچے کھودی گئی اس سرنگ کا مقصد مشرقی یروشلم کی فلسطینی آبادی کو اسلحہ پہنچانا تھا۔ غرب اردن کے ہر چوک اور چوارہے پر فوجی چوکیاں ہیں۔ جب پانی کا ایک قطرہ اور غذا کا ایک دانہ بھی اسرائیلی فوج کی اجازت کے بغیر یہاں نہیں پہنچ سکتا تو سخت پتھریلی زمین میں سرنگ کھودنے اور اسے کنکریٹ سے مضبوط کرنے کے لیے بھاری مشینری، سریا، سمینٹ اور بجری کیسے یہاں لائی گئی؟ فلسطینیوں نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ یہ انکشاف غرب اردن میں ایک بڑے آپریشن کی پیش بندی ہے۔

جامعہ القدس: جنگ کے سائے میں علم کی فتح

غربِ اردن کے نہایت دشوار حالات اور مسلسل کشیدگی کے باوجود جامعہ القدس(Al-Quds University)نے دنیا کی ممتاز 1000 جامعات میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ یہ درجہ بندی برطانوی ادارہ Quacquarelli Symonds(QS)ہر سال جاری کرتا ہے جسے دنیا بھر میں QS World University Rankings کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسرائیلی جریدے الارض (Haaretz) کے مطابق جامعہ القدس نے طب (Medicine) دندان سازی (Dentistry) فارمیسی اور قانون کے شعبے میں تدریس، تحقیق اور اخلاقی معیارات کے حوالے سے نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ اب اس کے لبرل آرٹس اور کلیاتِ سائنس کا معیار بھی قابل رشک ہو گیا ہے۔ جامعہ القدس 1970ء میں قائم ہوئی۔ اس کا مرکزی کیمپس تقریباً 47 ایکڑ پر محیط ہے، جہاں لگ بھگ 15 ہزار طلبہ زیرِ تعلیم ہیں اور انہیں ایک ہزار اساتذہ تعلیم و تحقیق کی خدمات فراہم کر رہے ہیں۔ تعلیم کا چراغ اگر روشن رہے تو جنگ، محاصرہ اور سیاسی بے یقینی بھی کسی قوم کی علمی پیش قدمی کو مکمل طور پر نہیں روک سکتے۔ جامعہ القدس کی یہ کامیابی اسی حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ قوموں کی اصل طاقت ہتھیار نہیں، علم اور تحقیق ہوتے ہیں۔ اعلیٰ ترین علمی معیار کے ساتھ جامعہ کا نظریاتی تشخص بہت واضح ہے اور اس کی دیواروں پر کندہ عزم و حوصلے کے نعرے پاکستانی جامعات کی یاد دلاتے ہیں۔

ترتیب و پیشکش: سراج الدین ندوی

بچوں سے باتیں!

پیارے بچو!

اداریہ

ہمیں اپنے اردگرد کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنا بھی سیکھنا چاہیے۔ صفائی نصف ایمان ہے اور ایک مہذب انسان کی پہچان بھی۔ گندگی پھیلانا نہ صرف بری عادت ہے بلکہ اس سے طرح طرح کی بیماریاں بھی جنم لیتی ہیں۔ اگر ہم کچرا ادھر اُدھر پھینکنے کے بجائے کوڑے دان میں ڈالیں، اپنے گھروں اور اسکولوں کو صاف رکھیں اور دوسروں کو بھی صفائی کی تلقین کریں تو ہمارا ماحول خوشگوار اور صحت مند بن سکتا ہے۔ یاد رکھیں، چھوٹی چھوٹی اچھی عادتیں مل کر بڑی تبدیلیاں لاتی ہیں۔

سراج الدین ندوی

dawatweekly@gmail.com

ذہانت آزمائیے

نیچے دی گئی پہیلیوں کے جواب بتائیے:

1۔ وہ کون سی چیز ہے جو جتنا زیادہ چلتی ہے اتنا ہی گھٹتی ہے؟

2۔ وہ کیا ہے جو آپ کا ہے مگر لوگ اسے آپ سے زیادہ استعمال کرتے ہیں؟

3۔ ایسی کون سی چیز ہے جو پانی پیتے ہی مر جاتی ہے؟

4۔ وہ کیا ہے جس کے پاس چہرہ بھی ہے اور ہاتھ بھی، مگر نہ آنکھ ہے نہ بازو؟

5۔ وہ کون سی چیز ہے جو جتنی زیادہ نکالی جائے اتنی ہی بڑی ہوتی جاتی ہے؟

6۔ وہ کیا ہے جو خود تو نظر نہیں آتی مگر سب کچھ دکھا دیتی ہے؟

جوابات:

1۔ عمر	2۔ نام
3۔ آگ	4۔ گھڑی
5۔ گڑھا	6۔ روشنی

چار دانے

ملک منظور، کولگام جموں و کشمیر

کسی دور افتادہ وادی میں پرندوں کا ایک ڈیرہ تھا جہاں مرغے، مرغیاں اور چوزے امن و سکون سے رہتے تھے۔ وقت بدلا تو وادی کی فضا بدلنے لگی۔ چوزوں کے لہجے میں تلخی، باتوں میں جھوٹ اور رویوں میں بغاوت نمایاں ہونے لگی۔ والدین پریشان ہو گئے کہ اگر یہ نئی پود اخلاقی پستی میں گر گئی تو پوری قوم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

اس سنگین صورتحال پر قابو پانے کے لیے بوڑھے سردار نے ایک مشاورتی مجلس بلائی۔ طویل بحث کے بعد یہ طے پایا کہ بچوں کی روحانی غذا بدلنی ہو گی۔ انہیں عام دانوں کے بجائے چار خاص دانے کھلانے ہوں گے: صداقت، نرمی، صبر اور درگزر۔ لیکن یہ نایاب دانے صرف انسانوں کی بستی میں مل سکتے تھے۔ سردار نے ایک محنتی ٹیم تشکیل دی اور انہیں اس مقدس مشن پر روانہ کیا۔

راستے میں ایک خطرناک پہاڑ آتا تھا جہاں بھوکی اور مکار لومڑیاں گھات لگائے بیٹھی تھیں۔ ابھی ٹیم پہاڑ کے دامن میں پہنچی ہی تھی کہ ایک لومڑی نے جھاڑیوں میں چھپتے ہوئے سوچا، "آج تو قدرت نے خود ہی دعوت کا اہتمام کر دیا ہے!"

سردار مرغے نے بھانپ لیا کہ جھاڑیاں غیر فطری طور پر ہل رہی ہیں۔ اس نے خبردار کیا: "دوستو! ہوشیار رہو، مکار دشمن قریب ہے۔ قدم سے قدم ملا کر چلو، اتفاق ہی ہماری ڈھال ہے۔"

لومڑی ان کی چالاکی دیکھ کر باہر نکل آئی اور دھاڑی "بتاؤ، پہلے کس کا شکار کروں؟"

سردار مرغا ذرا نہ گھبرایا اور مسکرا کر بولا "خالہ! وہ وقت بیت گیا جب تم ہمارے باپ دادا کو اکیلا پا کر کھا جاتی تھیں۔ یہ 'اسمارٹ زمانہ' ہے، یہاں طاقت جسم میں نہیں، دماغ میں ہوتی ہے۔"

لومڑی نے تمسخر سے پوچھا "اسمارٹ زمانہ؟ تم کل بھی مرغے تھے، آج بھی مرغے ہو۔"

سردار نے جواب دیا "فرق شعور کا ہے۔ ہم اپنی قوم کے سپاہی ہیں اور ایک عظیم مقصد کے لیے نکلے ہیں۔ اگر ہمت ہے تو ہم سے شرط لگاؤ۔ دو منٹ میں اگر تم کسی ایک کو بھی پکڑ لو تو وہ تمہارا، ورنہ تمہیں راستہ دینا ہو گا!"

لومڑی نے غرور سے شرط مان لی۔ مقابلہ شروع ہوا تو مرغوں نے ایسی ہم آہنگی دکھائی کہ لومڑی جس کی طرف لپکتی، دوسرا اسے اڑ کر چکمہ دے دیتا۔ تھوڑی ہی دیر میں لومڑی ہانپنے لگی۔ اپنی ہار چھپانے کے لیے وہ بولی "جاؤ! تم کسی نیک کام پر نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہو، میں تمہیں بخشتی ہوں۔"

بالآخر یہ قافلہ انسانوں کی بستی میں پہنچا۔ وہاں انہوں نے ایک بزرگ کو تسبیح پڑھتے ہوئے دیکھا، لیکن گہرائی سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ صرف لفظوں کا ہیر پھیر تھا۔ آگے بڑھے تو ایک مدرسے میں بچوں کو بلند آواز میں کتابیں پڑھتے ہوئے پایا۔ ایک مرغے نے غور سے سن کر کہا "یہاں سچائی اور صبر کا درس تو دیا جا رہا ہے، لیکن ہمیں ان دانوں کا 'عملی نمونہ' ڈھونڈنا ہے۔"

بستی کے بازاروں اور گلیوں میں انہیں ہر طرف شور اور خود غرضی ملی۔ وہ مایوس ہونے ہی والے تھے کہ ایک کچے مکان کے صحن میں ان کی نظر ایک ماں پر پڑی۔ اس کے بچے شور مچا رہے تھے، شرارتیں کر رہے تھے، لیکن ماں کے ماتھے پر شکن تک نہ تھی۔ وہ کمالِ صبر سے انہیں کھانا کھلا رہی تھی، نرمی سے ان کے آنسو پونچھ رہی تھی اور ان کی غلطیوں پر درگزر کرتے ہوئے انہیں صداقت کے قصے سنا رہی تھی۔

مرغے سمجھ گئے کہ "چار دانے" کسی دکان یا مدرسے کی دیواروں میں نہیں، بلکہ ماں کی گود اور گھر کی تربیت میں پوشیدہ ہیں۔ وہ فوراً واپس لوٹے اور سردار کو حال سنایا۔ وادی میں تعلیم کے ساتھ ساتھ "تربیت" کا نظام رائج کیا گیا۔ بچوں کو صداقت کے پھول کھلائے گئے۔ ان میں صبر کرنے کی ہمت پیدا کی گئی۔ وہ نرمی کے پاسدار بن گئے اور درگزر سے کام لینے لگے۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے چوزوں کی کایا پلٹ گئی اور وہ پرندوں کی بستی ایک بار پھر امن، اخلاق اور طاقت کا گہوارہ بن گئی۔ ایک دن ایک چوزہ اڑنے کی کوشش کرتے ہوئے غلطی سے دوسرے چوزے پر گر گیا تو وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ تبھی تیسرے چوزے نے آ کر کہا "درگزر کرنا عظیم کام ہے لہٰذا عفو سے کام لو۔"

"مجھے معاف کر دو۔ میں نے جان بوجھ کر تم کو دکھ نہیں پہنچایا۔" چوزے نے کہتے ہوئے بات ختم کر دی۔

یوں دونوں چوزے شیر و شکر ہو گئے اور بھائی چارہ قائم رہا۔

ہنسو ہنساؤ

جج "کتنے تعجب کی بات ہے تم نے ایسے آدمی کی گھڑی چرائی ہے جس نے تمہارا علاج کیا ہے"

چور "کیا کروں جج صاحب میں مجبور تھا"

جج "کیا مجبوری تھی؟"

چور "ڈاکٹر صاحب نے ہر دو گھنٹے بعد دوا کھانے کے لیے کہا تھا اور میرے پاس گھڑی نہیں تھی"

***

ملّا نصیر الدین نے دواخانہ کھول لیا۔ ایک منچلے نوجوان کو شرارت سوجھی وہ بولا "حکیم صاحب مجھے بھی کوئی دوا تجویز فرما دیں، میں جب سونے کے لیے آنکھیں بند کرتا ہوں کچھ نظر نہیں آتا اور جب کھا لیتا ہوں تو بھوک نہیں لگتی"۔

ملّا نصیر الدین بولے "لو یہ دو خوراک دوا ہے ایک صبح جاگنے سے پہلے اور دوسری رات کو سونے کے بعد کھا لینا، ان شاء اللہ شفا ہو گی"۔

***

ایک پاگل اور بھکاری سڑک کے کنارے بیٹھے تھے۔ بھکاری کو بھوک لگی وہ روتے روتے چیخنے لگا کہ اے خدا یہ پاپی پیٹ تو نے دیا ہی کیوں"

پاس بیٹھا پاگل کہنے لگا "بیلٹ باندھنے کے لیے"۔

***

R. N. I. No. 34628 / 1980
Posted at Delhi R.M.S. Delhi - 110006
Published On Tuesday
Posted On Wednesday / Thursday
Issue Dated - 05th July to 11th July 2026.

Postal Regn. No. DL (S) -05/3541/2026-2028
Post Without Pre-Payment of Postage
Licence No. U (S) - 103 / 2026-28
Circulation & Advert - 9818799223
Account-billing : +91 8920589292

दावत ہفت روزہ دعوت نئی دہلی
DAWAT, NEW DELHI
www.dawatnews.net

Brainy & Bright ACADEMY

داخلے جاری ہیں۔

NEET / IIT-JEE

KNOWLEDGE AND ACADEMIC PARTNER
gravity® Orienting Intelligence

الحمدللہ ہمارے پہلے بیچ کے 9 طلباء وطالبات کا سلیکشن گورنمنٹ میڈیکل کالجز میں ہوا ہے۔

IRFAN ALI	SUHAIB SIDDIQUI	SIBTAIN RAZA	FARHAN AKHTAR	SAYYAED UJJAIR	KAIF ALAM	AHMAD SAFWAN	KHAN FALEH	KISHWAR N.
G.S.V.M.	G.M.C.	M.R.D.B.	U.P.U.M.S.	M.R.D.B.	M.P.T.	M.P.T.	JIIU'S IIMS&R	J.M.I.
KANPUR, U.P	BANDA, U.P	DEORIA, U.P	SAIFAI, U.P	DEORIA, U.P	SIDDHARTHNAGAR, U.P	SIDDHARTHNAGAR, U.P	JALNA, AURANGABAD	NEW DELHI

ہاسٹل کی سہولیات

طلباء وطالبات کے لیے علیحدہ کیمپس۔
تعلیم وتعلم کے لیے سازگار ماحول۔
آرام دہ اور سہولیات سے آراستہ کمرے۔
کھیل وتفریح کے لیے کشادہ میدان۔
صاف ستھرے ماحول میں تازہ اور صحت بخش غذا۔
طبی ضروریات کے لیے فرسٹ ایڈ کی سہولت اور کلینک۔
مشفق اور تربیت یافتہ نگراں اور CCTV کیمروں سے ہاسٹل کے ماحول کو منظم کرنا۔

Up to 100% SCHOLARSHIP will be granted to Meritorious Students.

ہمارے کورسز

چار سالہ انٹیگریٹیڈ کورس-نیٹ، جے ای ای کے ساتھ (نویں کلاس سے بارہویں تک)
دو سالہ انٹیگریٹیڈ کورس-نیٹ، جے ای ای کے ساتھ (گیارہویں کلاس سے بارہویں تک)
ایک سالہ نیٹ، جے ای ای کورس (بارہویں کلاس اور پاس آوٹ طلباء کے لیے)

شیروانی نگر، سیتاپور روڈ، لکھنؤ | رابطہ نمبر: 9889478516 | 9161399292

040-24522005/8
Cell:9154145387
عثمان پورہ، چادرگھاٹ حیدرآباد

55 سال سے انسانیت کی خدمت میں

مسلم میٹرنٹی اینڈ چلڈرنس ہاسپٹل

MUSLIM MATERNITY AND CHILDREN'S HOSPITAL HYDERABAD

Email:muslimmaternityhospital@gmail.com | Website: mmch-hospitals.in

زیر انتظام: اسلامک سوشل سروس سوسائٹی حیدرآباد۔ Regd. No.565/70(ISSS)

★ جدید سہولیات کے ساتھ ایک غیر منافع بخش ہسپتال

★ خواتین کی ذریعہ سے خواتین کے لیے ★ تلنگانہ میں سب سے زیادہ نارمل ڈلیوریز کا واحد دواخانہ ★ سالانہ 3500 ڈلیوری کی جاتی ہیں۔

رعایتی فیس اور معیاری علاج

24 ہماری خدمات

★ زچگی اور گائناکالوجی ★ پیڈیاٹرکس اینڈ نیونٹولوجی ★ اینستھیزیا اور بغیر کسی تکلیف کے زچگی
★ لیبارٹری اور ریڈیولوجی ★ فارمیسی اور ایمبولینس کی سہولت

ہسپتال کا بنیادی ڈھانچہ

★ OPD انتظار کیلئے کشادہ جگہ۔ ★ AC لیبر روم ★ ہائی رسک مریضوں کے لیے آئی سی یو کی سہولت ★ میجر اوٹیز ★ معمولی اوٹیز۔
★ لیول-3 NICUIII کے لئے عمدہ آلات ★ جدید آلات کے ساتھ PICU ★ نوزائیدہ بچوں کے لیے OAE سماعت کی اسکریننگ
★ سونوگرافی اور ڈیجیٹل ایکسرے کی سہولت ★ لیپرواسکوپک ومنیمل آکسیس سرجری کی سہولت ★ دواخانہ کے اندرہی کینٹین اور کھانے کی سہولت

پولی کلینک خدمات

کمپنی و سرکاری معاوضہ کی سہولت۔ (ری ایمبرسمنٹ Reimbursment)

★ جنرل میڈیسن ★ جنرل سرجری ★ اینڈوکرائنولوجی ★ ڈرمیٹولوجی وکاسمیٹولوجی، ★ بچوں کی سرجری اور ختنہ ★ آرتھوپیڈک ★ فیزیوتھیراپی

ہاسپٹل کے خصوصیات

★ 200 بستروں پر مشتمل غیر منافع بخش جدید ٹیکنالوجی وسہولیات سے آراستہ منفرد ہاسپٹل ★ ماہر وتجربہ کار ڈاکٹروں کی خدمات 24 گھنٹے دستیاب۔
★ 40 بستروں کی Level III این ائی سی یو کی سہولت ★ 15 بستروں کی Level II پی ائی سی یو کی سہولت ★ مرحلے کے ساتھ نیکہ وبچوں کی نگہداشت

تعلیمی کورسس

★ ہوسپٹل کو Obstetric, DNB Gynec & DNB PAEDIATRICS میں پوسٹ گریجویٹ کورسز، IAP کے ذریعے
★ Neonatology میں فیلوشپ، MRCOG, MRCPCH کیلئے امریکن یونیورسٹی، B.SC نرسنگ کالج کے لیے تسلیم کیا گیا ہے۔
★ 4 چار سالہ بی ایس سی نرسنگ کورس KNR یونیورسٹی سے منظور شدہ (رہنے وکھانے کے لیے ہاسٹل کی سہولت)

Under the Management of Islamic Social Service Society (ISSS) Regd.No.565/70), Hyderabad
(A CHARITABLE INSTITUTE)

Dr. Anees Fatima
M.B.B.S; MD-HA (NIMS)
Asministrator

Dr. Shameem Rizwana
BAMS, MD (Hospital Management)
Group CEO, ISSS

President
Mohd Azhar Uddin

Vice President
Syed Mohammed Abdul Qadar Nasir

Secretary
Dr. Mubashir Ahmed

Joint Secretary
Farhan Mohammed Khan

SHAHEEN GROUP OF INSTITUTIONS | 35 Years of SHAPING FUTURE WITH EXCELLENCE

Class XI-XII (Science)
Integrated with NEET/JEE

Class XI-XII (Arts)
Integrated with UPSC/CLAT

Class XI-XII (Commerce)
Integrated with CA Foundation

NEET LONG TERM
Repeaters Batch

Shaheen Value School
KG to Class X

BA/B.Sc/B.Com/BCA
Integrated with UPSC

Toll Free 1800 121 6235
www.shaheengroup.org

Printed and Published by Mohammad Ahmad (Editor) on behalf of Dawat Trust (Regd.) and Printed at Impressions Printing & Packaging Limited, C- 21 & C- 22, Sector-59 Noida- 201301 (U.P.) & Published at D-314, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, NEW DELHI -110025. R.N.I. No. 34628/1980

HONORARY Editor In Chief Dr. Faheemuddin Ahmed, Editorial Articles/Reports - 040 66817860, Email id - dawatweekly@gmail.com
Manager- Naiem Khan : 9891160829, Email: mgrdawat@gmail.com (نوٹ: ادارہ دعوت کا مضامین سے مکمل اتفاق ضروری نہیں۔)